شخص • شاعر

خالدؔ

شخص و شاعر

اچھی کتاب
کا
نکھار
ہمیشہ قائم
رہتا ہے!

خالد

شخص و شاعر

مرتّب

حسین سحر

آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور۔

اشاعت اوّل ۱۹۷۶ء

تعداد، ۱۰۰۰

قیمت: بارہ روپے

اہتمام

م۔ ع۔ سلام

آئینہ ادب۔ چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور

فون نمبر ۶۷۵۰۴

(مجلسِ اہلِ قلم ملتان کے تعاون سے)

خوشنویس

صالح محمد جمالی، ملتان

پریس،

انتساب

غالد شناسوں کے نام

ترتیب
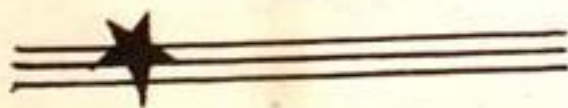
عرضِ مُرتّب

ہمارے مُردہ پرست معاشرے میں عام طور پر کسی دانشور کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے تعزیتی قراردادیں منظور کی جاتی ہیں، جلسے ہوتے ہیں، مضامین لکھے جاتے ہیں۔ جن میں جی بھر کے مرنے والے کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ لیکن جیتے جی کسی کو اس کے بارے میں دو چار کلماتِ خیر کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اس صُورتِ حال میں کسی زندہ ادیب یا شاعر کی عزّت افزائی اور قدر شناسی ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور وہ لوگ خوش نصیب ہیں جنہیں زندگی میں ہی عزّت مل جائے۔ عبدالعزیز خالد بھی ایسے ہی خوش نصیب اہلِ قلم میں سے ہیں، جنہیں اپنی زندگی میں ہی عزّت اور شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اور جیتے جی انہیں وہ مقام مل گیا ہے جو بہت سوں کو مرنے کے بعد بھی میسّر نہیں آتا۔ اُن کی دو درجن کے قریب تصانیف بڑے اہتمام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اور بعض کتابوں کے ایک سے زائد ایڈیشن بھی آ چکے ہیں۔ دو ادبی رسالوں نے اُن پر خاص نمبر شائع کئے ہیں اور دو رسالے عنقریب نمبر نکال رہے ہیں۔ آئے دن اُن کے ساتھ مُلک کے مختلف شہروں میں شامیں منائی جاتی ہیں۔ غرض ہر جگہ اور ہر کہیں اُن کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، اور یہ سب کچھ اس زندہ حقیقت کا ثبوت ہے کہ خالد نے ادبی دُنیا میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور دوست کیا، دُشمن بھی اب ان کی عظمتِ فن کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے کہ ہم عصر اہلِ قلم میں سے کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں اتنے وافر مواد کی موجودگی میں اس کتاب کو

مرتب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو عرض یہ ہے کہ اُن پر واقعی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر یہ سینکڑوں مضامین کی صورت میں مختلف ادبی رسالوں میں اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا، ضرورت تھی کہ ان مضامین کا کوئی انتخاب کیا جائے تاکہ خالد کے ذکر و فن سے دلچسپی رکھنے والوں کو کسی ایک جگہ پر اُن کے بارے میں مواد مل سکے۔ یہ کام خاصا مشکل اور وقت طلب تھا، لیکن الحمد للہ احباب کے تعاون سے یہ مشکل آسان ہوگئی اور موجودہ کتاب کی صورت میں چند منتخب مضامین مرتب ہوگئے۔ مجھے کوئی دعویٰ نہیں کہ یہ انتخاب بہترین ہے۔ اس لئے کہ انتخاب بہرحال ذاتی پسند و ناپسند کے تابع ہوتا ہے۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ یہ کتاب یہاں خالد پر کام کرنے والوں کے لئے حوالے کا کام دے گی وہاں عام قاری کے لئے بھی مفید رہے گی۔ اس لئے کہ اس میں خالد کی شخصیت اور ان کی شاعری کے کم و بیش تمام گوشے بہت حد تک روشن ہوکر سامنے آگئے ہیں۔ اس طرح گویا خالد شناسی کے سلسلے میں جسے میں "خالدیات" کا نام دوں گا۔ یہ مجموعۂ مضامین اوّلین کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب کچھ مضامین کے بارے میں:۔

کتاب مرتب کرتے وقت میرے پیش نظر ایک ہی بات تھی کہ ایسے تمام مضامین یکجا کر دیئے جائیں جنہیں خالد کی شخصیت اور فن پر بہترین اور نمائندہ مضامین کہا جا سکے۔ سوائے میرے اپنے مضمون کے، جو کتاب کے آخر میں ہے اور جس کی شمولیت کا جواز صرف یہ ہے کہ یہ کتاب کے مرتّب کا مضمون ہے اور اس کے ذریعے خالد کے بارے میں خود مرتب کے اپنے خیالات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اپنی اس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہُوا ہوں۔ اس کا فیصلہ قارئین کر سکیں گے۔ کتاب میں شامل پہلے تین مضامین خالد کی شخصیّت کے بارے میں ہیں۔ جن میں مضمون نگاروں نے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ان کی شخصیّت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ باقی مضامین خالد کی شاعری کی مختلف جہتوں مثلاً نعت گوئی، قومی و ملّی شاعری، منظوم تمثیلات، تراجم اور غزلیہ شاعری وغیرہ کے علاوہ ان کے اسلوب خاص کے بارے میں ہیں۔ میں ان پر کوئی تبصرہ یا تنقید نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ یہ حق بھی قارئین ہی کا ہے۔ البتہ یہ ضرور وضاحت کردوں کہ ان میں سے اکثر مضامین "سیّارہ" اور "تحریریں"

کے "خالد نمبر" سے ماخوذ ہیں، اور کچھ براہِ راست لکھوائے گئے ہیں یعنی تازہ ہیں۔ چنانچہ مذکورہ رسالوں کے علاوہ مضمون نگار حضرات کے شکریے کے ساتھ ان کو کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ بعض مضامین میں ضرورت کے مطابق میں نے کہیں کہیں تدوین یا تلخیص سے بھی کام لیا ہے۔ مگر اس طرح کہ ہر جگہ مضمون نگار کے الفاظ اپنے ہیں۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں کیا۔ اس سلسلے میں جناب جعفر طاہر کا مضمون خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ مضمون بہت طویل تھا۔ اور اگر اسے پورے کا پورا شامل کیا جاتا تو کم از کم سو صفحات پر آتا۔ اس طرح کئی دوسرے مضامین شامل نہ ہو سکتے۔ چنانچہ مجبوراً میں نے جعفر طاہر صاحب کے الفاظ میں ہی اس کی تلخیص کر کے اصل سے تقریباً نصف صورت میں اسے شامل کیا ہے۔ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

میں مجلسِ اہلِ قلم ملتان کے ارکان، خاص طور پر محترم عاصی کرنالی اور برادرم وزیری پانی پتی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے گراں قدر مشوروں سے مجھے نوازا۔ اور مضامین کے پروف پڑھنے میں میری مدد کی۔ کتاب کے ناشر شیخ عبدالسلام مالک آئینہ ادب لاہور بھی میرے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ کتاب اشاعت کے مراحل طے کر ہی نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے یہ کتاب شائع کر کے جہاں خالد شناسوں پر ایک احسان کیا ہے، وہاں علمی اور ادبی دنیا میں اس خوشگوار اور قابلِ تقلید روایت کی ابتدا بھی کی ہے کہ اہلِ قلم کی ان کی زندگی ہی میں قدر کی جائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزا دے گا۔

آخر میں قارئین سے درخواست ہے کہ اگر انہیں اس کتاب میں کہیں کوئی خامی نظر آئے تو اسے میری کوتاہی سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ اور اگر کچھ پسند آ جائے تو اس کی داد متعلقہ مضمون نگار کو دیں، اس لئے کہ میں تو ان پریشان ادبی جواہر ریزوں کو صرف یکجا کرنے کا گنہگار ہوں!

حسین سحر

ملتان ـــــ یکم جولائی ۱۹۷۶ء

شاہد احمد دہلوی

عظیم شاعر عظیم انساں

چہرہ کتابی، رنگ شہابی، کشادہ پیشانی، شکنوں سے پاک، ہنداسی آنکھیں یوجا گتے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ایسے بند کہ بقولِ شاعر آپ کہیں کہ کوئی زخم تھا جو اچھا ہو گیا۔ بند ہوں تو غنچہ، کھلیں تو پھول۔ پرعزم ٹھوڑی، ڈاڑھی مونچھیں صاف، میانہ قد، چلیں تو سروِ رواں، بیٹھیں تو کوہِ گراں، گفتگو گل ریز، خموشی متکلم، دیر میں کھلتے ہیں مگر جب دل کی جواری کھل جاتی ہے تو ان کی باتوں میں راگ کی سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ ع

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار

سننے والے جھولیاں بھر کے اُٹھتے ہیں۔

خوش خوئی انہیں گدگداتی ہے۔ اور ان کی ہنسی اُبلتے چشمے کا نغمہ بن جاتی ہے۔ خوب ہنستے ہیں اور خوب ہنساتے ہیں۔ جن کے دل صاف ہوتے ہیں وہی ہنسا کرتے ہیں۔ اپنے دل کو تو صاف رکھتے ہی ہیں اوروں کے دلوں کا میل بھی دھوتے رہتے ہیں۔ سنا ہے کہ لارڈ بائرن کے پاؤں میں ہلکا سا لنگ تھا، مگر یہ اتنا اچھا لگتا تھا کہ لوگ اس کی تقلید کرنے لگے تھے۔ ان صاحب کی لکنت بھی اتنی خفیف اور اتنی لطیف ہے کہ جی چاہتا ہے ہم بھی اس کی نقل کرنے لگیں۔

ہا ہا! میں بھی عجیب آدمی ہوں کہ سراپا بیان کیے جا رہا ہوں اور نام اب تک نہیں بتایا۔ سنیے! یہ صاحب ہیں عبدالعزیز خالدؔ۔ خوش شکل، خوش وضع، خوش مزاج اور خوش گفتار۔ خالدؔ جو بہت بڑے شاعر ہیں، بہت بڑے افسر ہیں اور بہت بڑے انسان ہیں۔ شاعر اتنے بڑے ہیں کہ اچھے خاصے

پڑھے لکھے لوگ غالبؔ کی طرح ان کی مشکل پسندی کے شاکی ہیں۔ افسر اتنے بڑے ہیں کہ کروڑوں روپے کا حساب کتاب کرتے ہیں اور انکم ٹیکس دینے والوں کا ان سے دَم نکلتا ہے۔ انسان اتنے بڑے ہیں کہ بڑے آدمیوں کو چھوٹا اور چھوٹے آدمیوں کو بڑا سمجھتے ہیں۔

کوئی پندرہ سال ہوئے انہوں نے اپنی ایک نظم "ساقی" کے لئے بھیجی تھی۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ کونسی نظم تھی، ہاں یہ یاد ہے کہ اس میں بعض ایسے بھی الفاظ تھے جنہیں سمجھنے کے لئے مجھے غیاث دیکھنی پڑی تھی۔ مگر باوجود مشکل الفاظ کے اس نظم میں ایک گہری ابلاغی کیفیت بھی تھی۔ اس کی اشاعت کے بعد خالدؔ صاحب کا کلام بالالتزام "ساقی" میں شائع ہونے لگا۔ جی خوش ہوتا تھا کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان نے جدید اردو نظم میں ابہام سے مُنہ موڑ کر کچھ کام کی باتیں کہنی شروع کی ہیں۔

پھر ایک دن یہ ہُوا کہ انکم ٹیکس کا نوٹس میرے نام آگیا۔ دِلّی میں سالہا سال تک خاصی بڑی بڑی رقمیں اس محکمے کو دیتا رہتا تھا۔ مگر دفتر والوں کی بدتمیزیوں کی وجہ سے سوائے ایک دفعہ کے پھر خود کبھی نہیں گیا۔ میرے کاروبار کا منیجر اور ایک وکیل چلا جاتا تھا۔ یہاں نہ کاروبار، نہ منیجر نہ وکیل۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش، خود ہی حاضر ہونا پڑا۔

ایک بوسیدہ لونی لگی عمارت تھی جس پر تاریکی کی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ میدانِ حشر کی طرح یہاں سینکڑوں آدمی اپنے فائلوں کے اعمالنامے لئے حیران و پریشان کھڑے تھے۔ اِس عمارت کی کال کوٹھڑی پر میرے علاقے کے انکم ٹیکس افسر کے نام کی تختی لگی ہوئی دکھائی دی۔ اردو میں لکھا ہُوا تھا

"عبدالعزیز خالدؔ"

بڑا اچنبھا ہُوا کہ کہیں یہ صاحب وہی تو نہیں ہیں جن کی نظمیں "ساقی" میں شائع ہوتی رہتی ہیں؟ چپڑاسی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "صاحب اندر ہیں؟"

مُنہ پھیر کر بڑی حقارت سے بولا۔ "بیٹھ جاؤ صاحب کام کر رہے ہیں!"

بیٹھ گئے ایک لڑکھڑاتی ہوئی بنچ پر۔ چپڑاسی کو میرے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ ہُوا، اور وہ وہاں

سے اُٹھ کر چل دیا۔

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش   سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

جب میں بیٹھے بیٹھے سوکھ گیا اور وہ تازہ دم ہو کر واپس آیا تو اُس نے میری طرف متوقع نظروں سے دیکھا۔ میں کچھ نہیں سمجھا ورنہ ع

دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

پر عمل کرتا۔ میں نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے گائے قصائی کو دیکھتی ہے اور اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو "اب بھی دماغ ٹھکانے نہیں آیا؟ بغیر چاندی کی کنجی کے اس ہزاروں ہزاروں کے محکمے میں منہ اُٹھا کے چلے آئے؟" میں نے بڑے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"بھائی اب تو صاحب فارغ ہو گئے ہوں گے۔ صاحب نے دس بجے بلایا تھا۔ ناراض ہوں گے کہ ساڑھے دس بجے کیوں آئے۔ یہ ہماری پرچی اندر پہنچا دو!"

جب اُس نے دیکھا ان تلوں میں تیل نہیں ہے تو پرچی میرے ہاتھ سے چھین کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا۔ جب چھوٹے صاحب کا یہ عالم ہے تو بڑے صاحب تو سبحان اللہ ہی ہوں گے۔ یار سے وہ فوراً ہی واپس آکر بولا۔ "جاؤ صاحب بلا رہے ہیں!"

سو سو من کے قدم اٹھاتا میں کمرے میں داخل ہوا تو ایک وجیہہ نوجوان کو سرو قد ایستادہ پایا متبسم ہو کر ہاتھ بڑھایا۔ مصافحہ کیا۔ فرمایا۔ "تشریف رکھئے!" میز کی دوسری طرف ایک کرسی پر میں بیٹھ گیا۔ بڑے تپاک سے پوچھا۔ "آپ چائے پئیں گے یا کچھ ٹھنڈا پئیں گے؟"

میں نے کہا "جو آسانی سے مل جائے!"

انہوں نے گھنٹی بجائی وہی موذی اندر آیا۔ "اچھی سی چائے بنوا کر لاؤ۔ اور دیکھو پان بھی لاؤ!"

اُس نے کسی قدر تعجب سے میری طرف دیکھا اور باہر چلا گیا۔

صاحب نے کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی میں اسکول کے زمانے سے "ساقی" پڑھ رہا ہوں!"

میری جان میں جان آئی کہ یہ وہی شاعر خالد ہیں۔ پھر رسمی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کی خوش اخلاقی نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ کر لیا۔ ادب و شعر پر ان کی باتوں نے باور کرا دیا کہ انگریزی، فارسی اور اردو کا مطالعہ وسیع ہے۔ خود اپنی شاعری کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کم و بیش ایک گھنٹے تک یہ ملاقات جاری رہی۔ اس میں میرے بولنے کے پانچ منٹ اور خالد صاحب کے پچپن منٹ تھے۔ خالد صاحب رواں اور بے تکان بولتے ہیں ادب، معاشرت، سیاست، اخلاق، مذہب ہر موضوع پر اپنے سلجھے ہوئے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اس دوران میں چپراسی کئی بار اندر آیا اور چٹ دے گیا۔ چٹ پر ایک نظر ڈال کر خالد صاحب کہتے۔ "ان سے کہو ابھی ٹھہریں۔" کئی چٹیں جمع ہو گئیں، مگر خالد صاحب کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں، مجھ جیسا صابر و شاکر سننے والا ابھی تو کب کب ان کے ہاتھ آتا ہو گا۔ بارے ایک مقام ایسا آیا کہ انہوں نے ایک موضوع ختم کر کے ذرا سا توقّف کیا، مگر یہ توقّف بھی ع

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

کے انداز کا تھا۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھا کر کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا!"

بولے۔ "جی نہیں۔ آپ اور چائے پئیں گے؟ سنا ہے کہ دلّی والے بہت چائے پیتے ہیں؟" یہ کہہ کر ہنسے۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "بس اب نہیں۔ ہاں، وہ میرا فائل تو منگوا لیجئے۔" انہوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی سے کہا

"انسپکٹر صاحب سے کہو کہ شاہد صاحب کا فائل لائے۔"

انسپکٹر صاحب نے میرا فائل دیا۔ اسے دیکھا اور بولے۔ "اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چلئے اس بہانے آپ سے ملاقات ہو گئی!"

میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ خالد صاحب دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ چپراسی نے دیکھا کہ صاحب خود باہر تک آئے تو بہت ادب سے سلام کیا اور باہر جو ہجوم تھا اس میں دُور تک شاید یہ دیکھتا رہا کہ آخر ان صاحب کے سُرخاب کا پَر کہاں لگا ہُوا ہے۔

اِس پہلی ملاقات کے بعد خالد صاحب سے دوستی کے روابط پیدا ہو گئے۔ اگرچہ ملنا کم اور طویل وقفوں کے بعد ہوتا تھا پھر بھی جب ملتے تھے تو خلوص و محبت کے ساتھ۔ اکثر حضرات دو ایک ملاقاتوں کے بعد بے تکلّفی پر اتر آتے ہیں۔ مگر خالد صاحب سنجیدہ اور بُردبار آدمی ہیں۔ باوجود پندرہ سولہ سال کی ملاقات کے آج تک تکلّف قائم ہے۔ رُسوائے زمانہ تکلف نہیں بلکہ وہ لیئے دیئے پن کی کیفیّت جو ایک شریف انسان کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے۔ عالمی علم و ادب پر ان کی گہری نظر ہے اور اکثر ان کی گفتگو کا موضوع علم و ادب ہی ہوتا ہے۔ مگر وہ ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ خوب ہنستے ہیں خوب ہنساتے ہیں۔ لیکن ہنسنے میں بھی انہوں نے ایک حد قائم کر رکھی ہے۔ مثلاً یہ کہ انہیں قہقہہ لگاتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی ہنسی ایسی ہے، جیسے نرم رو چشمہ گنگنا رہا ہو۔ اور جب وہ ہنستے ہیں تو ان کے چہرے پر مسرّت کی ننھی ننھی لہریں پھیل جاتی ہیں۔ چہرہ اور زیادہ دلکش ہو جاتا ہے۔ یہ بات بہت کم دیکھنے میں آتی ہے کہ ہنسنے میں کسی کا چہرہ اور سنور جائے۔ بگڑتے بہت دیکھا ہے۔ بلکہ اکثر تو ایسے بیہودہ قہقہے دیکھنے میں آتے ہیں کہ بتّیس دانتوں کے ساتھ حلق میں کوّا لٹکتا بھی نظر آ جاتا ہے۔

خالد صاحب بہت نفاست پسند آدمی ہیں۔ ان کے دفتر کی میز پر فائلوں کا انبار دکھائی نہیں دیتا۔ میز پر خوبصورت قلمدان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ راکھ دانی تک نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود سگریٹ نہیں پیتے۔ پان بھی نہیں کھاتے۔ مگر تواضع میں چائے، کافی، اوولٹین کے علاوہ سگریٹ اور پان بھی ضرور ہوتا ہے۔ ان کے گھر پر بھی بارہا جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں بھی یہی صفائی ستھرائی دکھائی دیتی ہے۔

خالد صاحب کے ڈرائنگ روم میں چاروں طرف شیشے کی الماریاں لگی ہوئی ہیں۔ جن میں

انگریزی، اردو، فارسی اور عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں مقفل ہیں۔ الماریوں سے جو کتابیں بچ رہی ہیں وہ میزوں پر سلیقے سے چنی ہوئی ہیں۔ ڈرائنگ روم کے برابر میں ان کی اسٹڈی، یعنی کمرۂ مطالعہ ہے۔ اس میں کمرۂ ملاقات سے بھی زیادہ کتابیں ہیں۔ نئی سے نئی کتاب یا رسالہ جو چھپ کر آتا ہے پہلے ان کے ہاں پہنچ جاتا ہے۔ سوائے پڑھنے کے انہیں اور کوئی شوق نہیں ہے۔ لہذا ان کا مطالعہ اپٹوڈیٹ رہتا ہے۔ آپ کسی کتاب کا ذکر کیجیئے۔ یہ سامنے سے اٹھا کر آپ کو دے دیں گے۔ کتابیں اور رسالے بیچنے والے اُن کے ذوق کو جانتے ہیں۔ ادھر کوئی چیز آئی اور اس نے خالد صاحب کی لائبریری میں جگہ پائی۔

خالد صاحب بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں۔ ایک دفعہ میں اُن سے ملنے اُن کے دفتر گیا۔ نام کی پرچی اندر بھیجی تو فوراً بُلالیا۔ وہاں ایک صاحب کو دیکھا جو تن و توش میں گاماں کے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ صورت شکل ان کی خونی ڈاکوؤں جیسی تھی۔ میں علیک سلیک کر کے ایک علیحدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خوفناک آدمی خبر نہیں ان سے کب سے الجھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں اُبلی پڑتی تھیں اور اس کا اندازِ گفتگو بڑا جارحانہ تھا۔ خالد صاحب نرمی سے دھیمی آواز میں اُسے جواب دے رہے تھے مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت گھُٹ رہے ہیں، بہت ضبط کر رہے ہیں۔ خالد صاحب کہہ رہے تھے کہ "جو آپ کا جی چاہے کیجیئے مگر مجھے تو قانون کی پابندی کرنی ہے۔" میرے آجانے سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ان صاحب کی ملاقات کو خالد صاحب مزید طول دینا نہیں چاہتے۔ وہ شخص بھی اس اشارے کو سمجھ گیا تھا۔ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جھک کر خالد صاحب سے اُس نے کچھ کہا۔ خالد صاحب نے اسی اطمینان سے کہا۔ "جو آپ کا جی چاہے کیجیئے۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے اس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کون صاحب ہیں اور کیا کہہ رہے تھے؟"

بولے "فلاں ہوٹل کے مالک ہیں۔ بڑے بڑے آدمیوں سے میل جول ہے۔ انکم ٹیکس دینا نہیں چاہتے۔ دھمکی دے گئے ہیں کہ ہم آدمی کو مروا دیتے ہیں اور اس کی لاش کا بھی پتہ نہیں چلتا۔"

میں نے ان صاحب کا نام سُن رکھا تھا اور یہ بھی سُنا تھا کہ حکام رس اور بے حد خطرناک آدمی ہے۔ میں نے کہا" بہتر ہے کہ آپ اس سے نہ اُلجھیں اس کی پہنچ تو گورنر جنرل تک ہے!"

بغیر کسی ہیجان کے بولے۔" مجھے اپنا فرض بہرحال ادا کرنا ہے۔ موت زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہتا تو ابھی اسے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ مگر ایسے غنڈے بُزدل بھی بہت ہوتے ہیں۔ جو گرجتے ہیں برستے نہیں۔"

اور مجھے اس سے کچھ پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ خالد صاحب انکم ٹیکس کے محکمے میں نئے نئے آئے تھے اور ادائیگیٔ فرض کی شدّت میں اُنہوں نے اُس وقت کے گورنر جنرل کو انکم ٹیکس کی عدم ادائیگی کا نوٹس دے دیا تھا۔ اس پر ایوانِ عالی سے دریافت کیا گیا تھا کہ یہ کون شخص ہے جس نے اِس قسم کا نوٹس دیا ہے؟ ان کے کمشنر نے انہیں بلا کر سمجھایا تھا کہ اس طرح کا نوٹس سربراہِ حکومت کو نہیں دینا چاہیئے۔ مگر خالد صاحب نے نوٹس واپس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ گورنر جنرل کو اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ اس پر ٹیکس عائد ہو جاتا ہے۔ سربراہِ حکومت کو تو اور بھی زیادہ قانون کا پابند ہونا چاہیئے۔ ورنہ ؎ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

اندیشہ تھا کہ (دفتری زبان میں) خالد صاحب کو "سیک" کر دیا جائے گا۔ مگر اس کے بعد کی ملاقات میں معلوم ہُوا کہ سربراہِ مملکت نے واجبات ادا کر دیئے۔ اور فرمایا

" ہمیں ایسے ہی افسروں کی ضرورت ہے جو فرض کے ادا کرنے میں کسی سے مرعوب نہ ہوں!"

ہوٹل والے صاحب کی دھمکی بھی بے کار ثابت ہوئی اور ٹیکس اُنہیں بھی ادا کرنا پڑا۔ حُسن کارکردگی کے سلسلے میں خالد صاحب اپنے سب ساتھیوں میں سب سے پہلے اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس بنائے گئے۔

بیچ میں کچھ عرصہ کے لئے خالد صاحب کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انہیں عربی پڑھنے کا شوق ہُوا۔ حیدرآباد میں انہیں چند ایسے بزرگ مل گئے جو عربی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے جینئس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس میں شدید سے شدید تکلیفیں گوارا کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ خالد صاحب بھی عربی سیکھنے میں ساری کڑیاں جھیل گئے اور سال بھی پورا نہیں ہُوا تھا کہ اپنے معلّموں کا ناطقہ بند

کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے عجز کا اقرار کر کے ان سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ خالد صاحب نے عربی کا تمام اَدَبُ اَلقُدَمَا چاٹ ڈالا۔ قرآن مجید اور بائبل کو بالاستیعاب پڑھا۔ اساطیر الاوّلین اور دُنیا بھر کے علمُ الاَصنام کو بھی کھنگال ڈالا۔ ایک تو کریلا کڑوا اُوپر سے نیم چڑھا۔ یہ سارا علم ان کی شاعری میں ڈھل گیا۔ لوگوں کو پہلے ہی ان کی مشکل پسندی اور دُشوار گوئی کی شکایت تھی۔ اب جو یہ غضب ٹوٹا تو مالک رام جیسے عالم فاضل بھی پناہ مانگ گئے۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا۔ خالد صاحب بھی چہ کنم میں پڑ گئے ع

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ایک دفعہ خالد صاحب نے چند دوستوں کو کھانے پہ بلایا۔ ابنِ انشار تھے، پروفیسر ممتاز حسین تھے، اور اللہ آپ کا بھلا کرے جمیل جالبی تھے، میں تھا اور دو اور تھے۔ خالد صاحب کی کسی کتاب کے پروف ایک شلف میں رکھے ہوئے تھے۔ انشار صاحب نے ایک فرمہ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھتے پڑھتے بولے۔ "بھئی خالد! اب تو تمہاری شاعری ایک معمّہ بنتی جارہی ہے۔"

ہنس کر بولے۔ "معمّہ؟ وہ کیسے؟؟"

انشار صاحب نے بڑے خلوص سے کہا

"آپ یہ تو مانیں گے کہ ہم لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ دانشور نہ سہی۔ اوسط درجے میں تو ہمارا اشمار ہوتا ہی ہے۔ جب ہماری سمجھ میں آپ کے شعر نہیں آتے تو اور کسی کی سمجھ میں کیا آتے ہوں گے۔"

خالد صاحب نے مُنہ سا مُنہ بنا کر کہا۔ "میں تو کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو سمجھ میں ہی نہ آئے۔"

انشار صاحب نے فرمے پر نظر جماتے ہوئے کہا:

"اب اسی شعر کو لے لو۔" انہوں نے جو شعر پڑھا اس میں غدیر جلجل (غدیر [illegible] یا [illegible] تھا، یاد نہیں رہا) آیا تھا۔ انشار صاحب نے کہا "اب بتاؤ اسے کون سمجھے گا؟"

خالد صاحب نے چمک کر کہا "اس میں کیا بات ہے۔ [illegible] تالاب تھا جس میں امرالقیس کی محبوبہ عنیزہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ غسل کے لئے اُتری اور امرالقیس نے [illegible] اس کے کپڑے چُرا لیے تھے۔"

اس پر ہم سب ہنس پڑے۔ خالد صاحب نے ہم سب پر ایک استعجابی نظر ڈالی گویا کہہ رہے ہوں

ع تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

پھر کسی قدر تاسّف کے لہجے میں بولے۔ "آپ مجھ سے کیوں کہتے ہیں کہ میں نیچے اُتروں۔ آپ خود اپنے آپ کو اونچا کیوں نہیں کرتے؟"

بات بڑی پتے کی کہی تھی۔ ہم سب بغلیں جھانکنے لگے۔ فضا کچھ بدمزہ ہو چلی تھی۔ اور ابھی کھانا باقی تھا۔ میں نے رفعِ شر کے لئے کہا۔ واقعی یہ ہمارا عجز ہے۔ اقبال کچھ اسی طرف اشارہ کر گئے ہیں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے۔ ۱

خدا بندے سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور ہاں، اس کی پیروڈی بھی سُن لیجئے ؎

شکم کو کر بلند اتنا کہ ہر تقریب سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری غذا کیا ہے

اس پر سب پھر ہنسنے لگے مگر خالد صاحب نہیں ہنسے تو میں نے سوچا کہ معاملہ سنگین ہے۔ میں نے کہا:۔

"یہ شکایت ہر زمانے میں اور ہر ملک میں بڑے شاعروں سے رہی ہے۔ گوئٹے کی فاؤسٹ کو کتنے آدمی سمجھ سکے۔ خود اس زمانے میں جیمس جوئس کی یولی سیز ہے۔ سُنا ہے کہ ہمارے ہاں سوائے عسکری اور کلیم الدین احمد کے اسے کوئی نہیں سمجھ سکا۔"

پھر سب ہنس پڑے سوائے خالد صاحب کے۔ میں نے سوچا کہ یہ وار بھی خالی گیا۔ پھر کہا:۔

"مرزا غالب کو بھی اپنے معصروں سے یہی شکایت تھی کہ وہ ان کا کلام سُن کر ہنس دیتے تھے آج دیکھئے مرزا کا کیا مقام ہے۔ خالد صاحب! آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا چاہیئے کہ آپ کا کلام آپ سے سمجھنے کے محتاج نہ رہیں۔ بلکہ خود سمجھنے کے اہل ہو جائیں۔ مگر کیا ہم کبھی بھی اتنا علم و فضل حاصل کر سکیں گے جتنا آپ نے حاصل کر لیا ہے؟"

اس پر خالد صاحب مسکرائے اور بولے "تو پھر مجھے مطعون کیوں کیا جاتا ہے؟"

میں نے کہا، "آپ کو مطعون کرنا دراصل اپنی کم علمی کو چھپانا ہے۔" جب ان کے چہرے کی کھنچی ہوئی طنابیں کچھ ڈھیلی پڑیں تو میں نے کہا۔ "مگر خالد صاحب یہ بھی تو دیکھئے نا کہ شاعری کی شرطِ اوّل ابلاغ ہے۔ اگر ہم بھی آپ کے شعر کو نہ سمجھ سکیں تو گوئٹے اور جیمس جوائس کی طرح شاید گنتی کے آدمی آپ کے مخاطب رہ جائیں گے۔ یا پھر یہ کیجیئے کہ مرزا کی طرح آپ بھی اپنے خطوں میں اپنے بعض تلمیحی اشعار کی شرح کر دیجئے۔ مگر اس میں مشکل یہ پیش آئے گی کہ اصل سے کئی گنی تلمیحوں کی توضیح ہو جائے گی۔" اس پر خالد صاحب بھی ہنس پڑے اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ "بس اب آپ کھانا منگوائیے"۔ وہ ہنستے ہوئے گھر میں چلے گئے۔ اور پانچ منٹ بعد آ کر بولے۔ "آئیے!"

خالد صاحب اپنی عام زندگی میں بے حد محتاط آدمی ہیں اور خواتین سے ملنے میں ان کی یہ احتیاط اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یقیناً انہیں اس صنف سے نفرت نہیں ہے (اور نہ انہیں اپنی بیوی سے محبت کیوں ہوتی) لیکن وہ اسے بھی پسند نہیں کرتے کہ خواتین ان سے بے تکلف ہو کر ملیں۔ میں نے انہیں کسی خاتون سے گھل مل کر باتیں کرتے نہیں دیکھا۔ دُور ہی دُور رہتے ہیں۔ وہ تو مَردوں سے بھی لئے دیئے رہتے ہیں۔ ملنے میں کبھی سبقت نہیں کرتے۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ کیوں خواہ مخواہ ادیب اگر کسی سے اپنا تعارف کرایا جائے۔ "ارے بھئی اگر کسی کو ہم سے ملنا ہے تو وہ پیشقدمی کرے۔ شاید وہی توقع وہ خواتین سے بھی رکھتے ہیں۔ مگر کہیں ایسا بھی ہوتا ہے؟ نہیں ہوتا تو خالد صاحب بھی مستغنی المزاج ہیں ؎

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پُوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

ان کے استغنا کا مظاہرہ تو ڈھاکہ میں ہوا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھ لیجیئے:۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک سالانہ اجلاس جب پہلی بار ڈھاکہ میں ہوا تو مغربی پاکستان سے کوئی بتیس پینتیس نمائندے ڈھاکہ گئے تھے۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد انہیں مشرقی پاکستان کے بعض حصوں کی سیر بھی کرائی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ آٹھ افراد کھلنا اور سندربن جائیں۔ باقی افراد چٹگام سلہٹ

کاکسس بازار وغیرہ جائیں۔ چار خواتین بھی نمائندگی میں آئی ہوئی تھیں۔ لہذا ہمارے نمائندے منتظر رہے کہ دیکھیں یہ خواتین کدھر جاتی ہیں؟ ان چاروں نے چٹاگام وغیرہ جانے کا فیصلہ کیا چنانچہ ہمارے نمائندے بھی سب کے سب ادھر ہی ڈھل گئے۔ گلڈ کے کارکن سیکریٹری نے لاکھ سر پٹخا کم از کم آٹھ نمائندے تو کھلنا اور سندربن چلے جائیں۔ وہاں ایک خوبصورت سرکاری لانچ آپ کا منتظر ہے۔ جو سندربن میں دو سو میل اندر آپ کو لے جائے گا۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ عاجز ہو کر اس نے فرداً فرداً اپیل کی تو نسیم حجازی، عبدالعزیز خالد، شہرت بخاری، منیر نیازی، میں اور میری بیوی کھلنا اور سندربن گئے۔ میں نے خالد صاحب سے کہا:

"آپ خواتین کے ساتھ نہیں گئے؟" ہنس کر بولے "ہمارے ادیبوں کی ذہنیت دیکھی؟" میں نے کہا "آج سے کیا تیس سال سے دیکھ رہا ہوں!"

ہمارا سفر ہر لحاظ سے بہت اچھا رہا۔ چوبیس گھنٹے کے نہایت خوش منظر سفر کے بعد ہم خلیج بنگال کی ہندوستانی حد تک پہنچ کر لوٹے۔ واپسی میں چالنا کی بندرگاہ بھی دیکھی۔ چوتھے دن ہم ڈھاکہ واپس آگئے۔ جب جوانوں کا قافلہ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ خواتین میں رقابت پھوٹ پڑی اور ان کے طرفداروں کی ٹولیاں بن گئیں۔ سفر میں خاصی بدمزگی رہی اور دل برے ہو گئے۔

خالد صاحب اردو کے بہت بڑے سپاہی ہیں۔ جہاں اردو سے کام چل سکتا ہے وہاں انگریزی گوارا نہیں کرتے۔ بلکہ خالد صاحب جب اردو بولتے ہیں تو اردو ہی بولتے ہیں۔ کیا مجال کہ انگریزی کا ایک لفظ بھی ان کی گفتگو میں آجائے۔ جب کسی اردو کے ادارے سے انگریزی میں کوئی چٹھی یا دعوت نامہ ملتا ہے تو ان کا مزاج برہم ہو جاتا ہے۔ گلڈ جو پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کا بھی سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ اردو میں اس کی تمام مراسلت ہو۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب پاکستان کی قومی زبان اردو ہے تو انگریزی کو کیوں اب بھی اپنے اوپر مسلّط کر رکھا ہے۔ بے شک اس سے بڑھ کر اور کیا پست ذہنیت ہو سکتی ہے کہ اپنی زبان کو عاجز و درماندہ سمجھا جائے گلڈ کے اکثر جلسوں میں یہ دیکھا گیا کہ جب کوئی غیر ملکی ادیب مدعو کیا گیا تو اس نے اپنی تقریر قومی زبان

میں ہی کی۔ اور ہماری طرف سے جو جوابی تقریر کی گئی وہ انگریزی میں۔ کراچی کے علاقائی گلڈ کی حد تک میں نے اس بیہودہ روایت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ جب مہمانِ گرامی اپنی زبان میں تقریر کرتا تھا تو میں اپنی زبان میں تقریر کرتا تھا۔ ترجمان افہام و تفہیم کرتا تھا۔ خالد صاحب کے علاوہ میری اس حرکت سے سارے ناخوش تھے۔ یہ اصول میں نے اُس وقت سیکھا جب فلی پینیز میں ایک انجمن کی طرف سے کھانے پر انجمن کے صدر نے میرے لئے تعارفی اور خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میں اپنی مادری زبان میں بولنا پسند کروں گا" (حالانکہ ان کی سرکاری زبان انگریزی ہے) اس کے بعد انہوں نے اپنی زبان میں ایک مختصر تقریر کی۔ جس کا مفہوم میرے ساتھی ترجمان نے مجھے بتایا۔ میں نے جوابی تقریر کا آغاز انگریزی میں کیا اور کہا کہ "مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو اپنی زبان اس قدر پیاری ہے۔ مجھے بھی اپنی زبان اتنی ہی پیاری ہے۔ لہذا میں اردو میں بولوں گا۔" اس پر سامعین نے خوب تالیاں بجائیں۔ میں نے ایک رسمی سی تقریر اردو میں کی۔ فلی پینی ترجمان جو میرے ساتھ تھا میرا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس غریب کو صرف انگریزی آتی تھی۔ اردو سے اُسے کیا واسطہ؟ میں نے خود ہی انگریزی میں بتایا کہ پاکستان کا ہر فرد کم از کم تین زبانیں اچھی طرح جانتا ہے علاقائی زبان، قومی زبان اردو، اور انگریزی۔ انگریزی اس لئے جانتا ہے کہ ہماری تعلیمی زبان ابھی تک انگریزی ہے۔ فلی پینز کے اس واقعہ کے بعد میں نے طے کر لیا کہ میں اپنی زبان میں ضرور بولوں گا چاہے بعد میں مجھے خود اس کا ترجمہ کرنا پڑے۔

اکثر حضرات مجھے انگریزی سے نابلد سمجھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے پوری سی اردو بھی نہیں آتی۔

خالد صاحب حسابی آدمی ہیں۔ جب گلڈ بنا تو انہیں محاسبِ اعلیٰ بنایا گیا۔ انہوں نے پائی پائی کا حساب رکھا۔ اور اپنے فرائضِ منصبی بڑی دیانتداری سے انجام دیئے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ خلافِ قاعدہ ان سے کام لینے پر اصرار کیا جا رہا ہے تو انہوں نے خاموشی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ معاملت اپنی جگہ پر ہے اور دوستی اپنی جگہ پر مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ کرے ڈاڑھی

والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ نتیجہ یہ کہ گلڈ ایک نہایت مخلص اور دیانتدار کارکن سے محروم ہوگیا۔

خالد صاحب ایک باہمہ اور بے ہمہ آدمی ہیں۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں یہاں تک کہ ـــ بدخواہوں سے بھی۔ جن سے انہیں خلوص ہے ان سے ملنے کے لئے بیقرار رہتے ہیں۔ اگر ملاقات میں زیادہ وقفہ ہو جائے تو ٹیلی فون کرتے ہیں۔ پھر بھی ملاقات نہ ہو تو خود ملنے آجاتے ہیں۔ جیسا ان کا ظاہر صاف ہے ویسا ہی اُن کا باطن بھی صاف ہے۔ اُن سے مل کر جی خوش ہوتا ہے۔ کہ وہ نہ تو یارِ شاطر ہیں اور نہ بارِ خاطر۔ سیدھے سچے مسلمان ہیں۔ اُن کے اس سیدھے پن سے بعض نئے دوست وقتی طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اور کام نکل جانے کے بعد آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ مگر خالد صاحب کی یہ ادا بھی قربان ہو جانے کے لائق ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی حقِ دوستی ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے اور یقیناً یہ ایک بہت بڑے ظرف کی بات ہے۔

ع با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

بلکہ وہ اس حد سے بھی گزر کر ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کی منزل میں پہنچ گئے ہیں!

ارشاد احمد حقّانی

ایک سچّا فن کار

دُنیا کے تمام عظیم فن کاروں اور تخلیقی جبقریوں میں ایک قدرِ مشترک جو نمایاں طور پر ہمیں نظر آتی ہے اپنے فن سے ان کی گہری وابستگی، سچا عشق اور جذبہ وانہماک کی ایسی کیفیت ہے جو تمام دُوسرے جذبات، مصروفیات اور مشاغل پر غالب آجاتی اور جملہ دلچسپیوں اور تمام علائق کو فن کے تقاضوں کے تابع کر دیتی ہے۔ فن کی محبت ان کے اندر ایسی شدید ہوتی ہے کہ وہ ان کا مقصدِ زندگی بن جاتا ہے۔ اور تمام موانع اور مشکلات جو اس کی خدمت کی راہ میں حائل ہوں۔ سچا فن کار ان پر عبور حاصل کر لیتا ہے۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر میں نے جب بھی خالد کی زندگی پر غور کیا ہے مجھے وہ ایک انتہائی عظیم اور مخلص فن کار کے مقام پر فائز نظر آیا ہے۔ اس حقیقت کے لاتعداد شواہد اور مظاہر میری آنکھوں نے دیکھے ہیں کہ اس کا فن ہی اس کی زندگی ہے۔ اس کا مقصدِ حیات ہے اور اس سے ہٹ کر اسے اس زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ فن سے قطع نظر ایک عام انسان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو خالد ایک کامیاب آدمی ہے اور اسے زندگی، اس کی مادّی دلچسپیوں اور مسرّتوں سے محبت ہونی چاہیئے اور دُنیاوی لحاظ سے ایک مطمئن اور پُر مسرّت زندگی گزارنے پر آمادہ ہونا چاہیئے۔ لیکن خالد کی زندگی، اس کے شب و روز، اس کی قلبی و روحانی کیفیات، اس کی پسند اور ناپسند، اس کی جلوت اور خلوت، اس کے ظاہر اور باطن کا ایک ایسا قریب ترین شاہد ہونے کی حیثیت سے جس کی نظروں سے شاید اس کی زندگی، اس کی آرزوؤں، اس کی امنگوں، اس کی امیدوں، اس کی حسرتوں، اس کی خوشیوں، اس کی محبتوں، اس کی نفرتوں، اس کی مایوسیوں،

——— اس کی کامیابیوں، اس کے مقاصد، اس کے ۶۰ ۱ئم کا کوئی پہلو اور کوئی زاویہ امکانی حد تک اوجھل نہیں۔ میں علیٰ وجہ البصیرت یہ گواہی دیتا ہوں کہ خالد ایک سچا فن کار ہے۔ وہ اور اس کا فن ایک چیز ہیں۔ بقول اقبالؔ یہی اس کی نماز اور یہی اس کا وضو ہے۔ اس کا فن ہی اس کی کُل زندگی ہے۔ اس کی خدمت اس کا مقصدِ حیات ہے۔ اور ہر وہ دلچسپی اور ہر وہ سرگرمی اس کے لئے بے معنی اور محض تضیعِ اوقات ہے جو فن کی خدمت میں معاون و مددگار نہ ہو۔ فن کے بغیر مئے حیات اس کے لئے زہر ہے، جس کا ایک قطرہ بھی پینے کے لئے وہ تیار نہیں۔ خالد ایک صحت مند، خوش و خرم انسان اور ایک اچھے عہدے پر فائز سرکاری افسر ہے۔ لیکن اس نے بارہا مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ فن کی خدمت کا امکان نہ ہو تو میں اس طبعی زندگی میں ایک دن کے لئے بھی دلچسپی نہیں رکھتا۔ یہ بات محض ایک قول نہیں ہے۔ افسردگی اور ناکامی کی کسی وقتی کیفیت کا ردِعمل نہیں کہ یہ کیفیات یوں بھی خالد پر بہت کم طاری ہوتی ہیں۔ اس کی پوری زندگی، اس کی ایک ایک دلچسپی، اس کا ایک ایک لمحہ اس کی صداقت کا گواہ ہے۔ حد یہ ہے کہ خالد کے کردار اور شخصیت کے بعض پہلو اور انداز ایسے ہیں جو ایک سطحی یا اتفاقی مبصّر کی نظر میں اس کی کمزوریاں یا خامیاں شمار کئے جا سکتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا فن اور اس کا مقصد جس طرح اس کی پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے چکے ہیں۔ اس کے بعض غیر معمولی نتائج ہیں جو اس کی فن کارانہ عظمت اور فکری یکسوئی کی دلیل ہیں۔ اور حقیقتاً وہ اس کی خامیاں نہیں اس کے فنکارانہ اخلاص کی معراج ہیں۔ خالد منفرد مزاج و شخصیت کا حامل ایک غیر معمولی انسان ہے۔ اس کے اعمال اور کردار اور رویوں کو عام پیمانوں سے ناپنے والا، اور مروّج معیاروں پر پرکھنے والا اس کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے نہ حقیقت کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک عام انسان کی حیثیت سے خالد میں بھی کمزوریاں ہوں گی۔ ممکن ہے آپ کو اس کے کسی رویّہ سے اختلاف ہو لیکن اگر آپ اس کا فہمی اور ماہرانہ مطالعہ کریں گے اور آپ کے اندر انسانی رویوں اور ان کے محرّکات کو سمجھنے کی پوری استعداد ہوگی تو آپ یہ فیصلہ دینے پر مجبور ہوں گے کہ وہ ایک نیک نفس انسان اور ایک سچا فن کار ہے۔ جس نے فن کی پرستش کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کا محبوب ایک اور صرف

ایک ہے اور وہ اس کا فن اور شعر ہے۔

خالد کی اس کیفیت کا میں ایک پرانا شاہد ہوں۔ اور اس کی تمام جسمانی توانائیوں اور ذہنی صلاحیتوں کو میں نے اس کے فن کے لئے شروع ہی سے وقف دیکھا ہے۔ لیکن اس کے چند ایسے غیر معمولی مظاہر بھی میرے سامنے آئے ہیں جنہوں نے مجھے حیرت زدہ کر دیا اور مجھے اور بھی وضاحت سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ فن کی دیوی نے کس طرح خالد کو اپنی زلف کا اسیر بنا رکھا ہے۔ خالد کی صاحبزادی کا نکاح تھا۔ مہمان آچکے تھے۔ نکاح پڑھے جانے کی انتظار ہو رہی تھی۔ اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا جو خالد کے مکان پر ہی تھا۔ میں کچھ تھوڑا بہت انتظامات کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ درمیان میں کبھی کبھی مجھے چند منٹ خالد کے پاس بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ایسے مواقع پر میزبان اور صاحب خانہ کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اور اس کی توجہ کن مسائل پر مرکوز ہوتی ہے میزبان کیسا بھی صاحب وسائل ہو، کچھ نہ کچھ اضطراب، گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ کی کیفیت بہر حال پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ خالد پوری دلجمعی، سکون اور تحمّل کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ اور جب بھی میں اس کے قریب گیا۔ انتظامات کے بارے میں ایک آدھ مشورہ دینے یا استفسار کرنے کے علاوہ اس نے مجھ سے جو گفتگو کی وہ اس طویل نعت کے بارے میں تھی۔ جو "حمطایا" کے عنوان سے لکھنے کا وہ ارادہ کر رہا تھا۔ اور جس کے ابتدائی اشعار اس نے گزشتہ شب لکھے تھے۔ اس نے مجھے دو تین ایسے اشعار سنائے بھی جو اُس وقت کے ملکی حالات کے پس منظر میں خصوصی اہمیت کے حامل تھے، دوسرا موضوع جس پر عین اسی وقفہ میں میرے اور اس کے درمیان گفتگو جاری رہی وہ انٹرویو تھا جو لاہور ریڈیو کے پروگرام "تیس منٹ میرے ساتھ" کے لئے اُسے صرف ایک روز بعد ریکارڈ کرانا تھا۔ خالد عین اُس وقت اِس انٹرویو کا خاکہ ذہن میں تیار کر رہا تھا اور اس ضمن میں بطور مشورہ مجھ سے کچھ تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ درمیان میں جب ایک مرحلہ پر یہ محسوس ہوا کہ ابھی نکاح خوانی میں مزید چند منٹ کی تاخیر ہے تو خالد اٹھ کر اپنے مطالعہ کے کمرے میں آ گیا۔ جہاں اس نے "حمطایا" کے ابتدائی اشعار مجھے سنائے۔ ہم مشکل دو چار شعر ہی پڑھ پائے تھے کہ بعض حضرات کی اس کمرے میں آمد سے وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور ہم واپس

برآمدے میں مہمانوں کے پاس آگئے۔ اس وقت میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ خالد کیسا سچا فنکار ہے کہ ایسے غیر معمولی حالات اور لمحات میں بھی اس کا قلب و ذہن اور اس کا تخیّل اپنے ماحول سے یکسر بے نیاز علائقِ دنیوی سے "ورارالوریٰ، آفاق کی بلندیوں پر محوِ پرواز ہے۔ اور فن کار خالد اس کی دُوسری تمام حیثیتوں کو کاملاً زیر کر چکا ہے۔

فن کی محبت نے خالد کو زندگی اور اس کے مسائل و مشکلات کے بارے میں ایک خاص فلسفہ اور رویّہ کا علمبردار بنا دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فن اس سے جذبات و احساسات کی زبردست قربانی چاہتا ہے۔ لیکن ہوشمند اور ذمہ دار انسان کی حیثیت سے وہ اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے فن کے تقاضوں اور معاشرتی فرائض کے درمیان ایک حسین توازن قائم کرتے ہوئے یہ طے کر لیا ہے کہ ہر معاملہ کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے کم از کم ناگزیر توجہ کا حصّہ تو دیا جائے۔ لیکن کسی بھی مسئلہ کو اپنی زندگی پر چھا جانے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ چنانچہ اُس نے عائلی ذمہ داریوں، والدین، اعزّہ و اقربا، اور احباب کے حقوق، خود اپنے نفس کے تقاضوں، اپنی ملازمانہ ذمہ داریوں اور ان سے پیدا ہونے والی گوناگوں پیچیدگیوں اور مشکلات، سب کو اپنی فکر و عمل کی دُنیا میں ایک واضح جگہ دے دی ہے اور کسی بھی حالت میں وہ ان چیزوں کو اپنی متعیّن کردہ حد سے زیادہ اہمیت حاصل کرنے نہیں دیتا۔ اس نے اپنے فکر و عمل کو ایسا منضبط بنا لیا ہے کہ کوئی بھی دلچسپی، کوئی بھی مسئلہ، کوئی بھی اُلجھن، کوئی بھی غم اور خوف کوئی بھی معاشرتی تقاضا یا دباؤ اس طرح اس پر سوار نہ ہو جائے کہ اس کا فن اور اس کی خدمت کے تقاضے مجروح ہو سکیں۔ خالد جیسے عاشقِ فن اور غیر معمولی انسان کے لئے ایسا توازن قائم کرنا کچھ ایسا آسان نہ تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کی زندگی یک رُخا اور غیر متوازن ہو جاتی۔ لیکن چونکہ اس نے اپنے دل کو پاسبانِ عقل کی نگہداشت میں دے رکھا ہے۔ اس لئے قدرت نے اُسے ہر قسم کی افراط او تفریط سے بچا لیا ہے۔ لیکن اس راہ پر قائم رہنے کے لئے اسے ہمہ وقت بیداری اور خود نگری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ تقویٰ اور صبر اپنے وسیع ترمعنوں میں اسی ضبط، اسی انضباط، اسی استقامت کا نام ہے۔ خالد کو اپنے قریب ترین انسانی ماحول، اپنی ملازمت

کے ضمن میں بعض اوقات ایسے پریشان کن حالات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اب چند روز کے لیے وہ شعر و شاعری کا نام نہیں لے سکے گا۔ اور فن کا سارا عشق اس کو بھول جائے گا۔ لیکن حیران کن حد تک مختصر عرصہ میں وہ اس ذہنی کیفیت پر قابو پا لیتا ہے اور اس کا فلسفۂ زندگی یوں اس کی دستگیری کو آتا ہے۔ کہ غم اور فکر، اضطراب اور اعصابی کھچاؤ اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے ان کا وجود ہی نہ تھا۔ خالد سمجھتا ہے کہ چونکہ فن کی خدمت ایک پیغمبرانہ صفت ہے اس لیے اس اعلیٰ و ارفع مقصد کو دُوسرے تمام مقاصد پر ترجیح ملنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ بچّی کے نکاح جیسے اہم معاملہ کو بھی جائز اور مناسب توجہ دینے اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس کی ضروریات اور تقاضے پورے کیے جا چکے ہیں وہ اپنے ذہن کو فن پر لگا سکتا ہے۔ وہ چونکہ یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ اُسے اپنے فن کی خدمت پر قدرت نے مامور کیا ہے اور اس کا فن ایک عظیم اور آفاقی مقصد رکھتا ہے۔ اس لیے اُس نے اپنے آپ کو فن کے لیے وقف کر کے اپنے تمام تفکّرات کو اس ذات کے حوالے کر دیا ہے۔ جس کے تفویض کردہ فرض کی ادائیگی میں وہ خود مصروف ہے۔ وہ "کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما" اور مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ کی منزل کا راہی ہے۔

اس کے نزدیک انسان کی تخلیق کا مقصد اپنی ذات کی تکمیل کے ذریعہ خدا تک پہنچنا ہے۔ اور بحیثیت ایک فن کار اس کی تکمیل اس کے فن کی خدمت میں مضمر ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ اپنے فن کے لیے دن رات کام کرے۔

ایک انتہائی حسّاس ادیب اور شاعر کی حیثیت سے وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ حاضر و موجود سے بیزاری اور ایک بہتر تبدیلی کی خواہش اسے ہمہ وقت بے چین اور بیقرار رکھتی ہے۔ قومی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والا ہر خوشگوار اور ناخوشگوار واقعہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے ایک طویل عرصہ تک خالد کی کیفیت یہ رہی ہے کہ قومی و ملّی حالات کی دگرگونی اور معاشرہ کے مختلف طبقات کی بے راہ روی اسے انتہائی افسردہ اور پریشان کرنے کا باعث بنتی۔ وہ چاہتا کہ ہمارے قومی اور انفرادی رویّے، ہماری روایات اور تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔ اور ہم زندہ اور اعلیٰ کردار کی حامل اقوام

کا رویّہ اختیار کریں ۔ وہ بعض اوقات نجی تبادلۂ خیالات میں خفگی اور بیزاری کا اظہار کرتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خالد کے رویّہ میں تبدیلی آگئی ہے ۔ اب اس کی رائے یہ ہے کہ معاشرے کی بے راہ روی سیاسی و تعلیمی، انتظامی و مذہبی شعبہ ہائے زندگی کے اربابِ حل و عقد کی بے عملی یا بد عملی پر کُڑھنے، تنقید کرنے اور اپنا خُون جلانے کے بجائے ایک فن کار کی حیثیت سے اسے سارا زور اپنے فن کی تکمیل پر دینا چاہیئے ۔ اور اپنے کام اور پیغام کے ذریعے دعوتِ عمل اور دعوتِ اصلاح دینی چاہیئے قرآن کی تلقین کے مطابق اپنے آپ کو داروغہ یا خدائی فوجدار نہیں سمجھنا چاہیئے ۔ کہ اس طرح توانائیوں کا ضیاع ہوتا ہے ۔ دُور رس نتائج نہیں نکل سکتے اور بنیادی اصلاح کا مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا اس طرح اب اس نے بظاہر معاشرہ سے ایک قسم کی بے تعلقی لیکن فی الحقیقت ایک زیادہ گہرے تعلق کا رویہ اپنا لیا ہے ۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی توانائیاں منفی اظہارِ افسوس پر ضائع نہیں ہوتیں ۔ بلکہ وہ تخلیق کے عظیم اور ارفع مقصد کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں ۔ خالد کے اندازِ فکر میں مذکورہ تبدیلی نے اس کی زندگی میں بڑا سکون، بڑا ٹھہراؤ، بڑا توازن اور قرار اور طمانیتِ قلب و ذہن کی ایک غیر معمولی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ اب وہ غلطیوں اور بُرائیوں، کوتاہیوں اور حماقتوں کو دیکھ کر جلتا ہے نہ کُڑھتا ہے ۔ لیکن پہلے سے زیادہ انہماک اور محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتا ہے ۔ خالد بے پناہ دردِ دل کا مالک ہے ۔ اس کا ہلکا سا اظہار اس کی اُن نظموں میں ہُوا ہے جو اس نے حال ہی میں لکھی ہیں ۔ خالد مسلمانوں کو فکر و عمل کی ایسی معراج پر فائز دیکھنا چاہتا ہے جہاں سے وہ دنیا کی قیادت کر سکیں ۔ لیکن اس کے نزدیک ۔ انہیں اس مقام پر لانے کے لئے ایک فن کار کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ خود عمدگی، فن کارانہ مہارت اور حُسنِ عمل کا ایک انتہائی بلند معیار قائم کرے ۔

خالد نے اپنی پوری شخصیت اور زندگی کو فن کی خدمت کے لئے جس طرح وقف کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ ذہنی ریاضت اور مسلسل مطالعہ سالہا سال سے اس کا معمول ہے ۔ دفتری مصروفیات جو ایک آدمی کی تمام توانائیاں نچوڑ لینے کے لئے کافی ہونی چاہئیں اور جن کے بعد کسی تخلیقی سرگرمی کی گنجائش نہیں رہتی اسے اپنے کام سے باز نہیں رکھ سکتیں ۔ دفتر میں سات آٹھ گھنٹے کی مسلسل نشست اور مختلف النوع

مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے بعد خالد تھوڑی دیر آرام کرتا ہے۔ اور جونہی اس کی توانائی بحال ہوتی ہے۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ دفتری تفکرات کو شعوری کوشش سے فراموش کرکے اپنے ذہن کو ایک ایسے کام پر لگا دیتا ہے جو سخت جان لیوا اور صبر آزما ہے۔ خالد کو چونکہ زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ وقت اور فرصت کی کمی کا شاکی رہتا ہے۔ قدرت اگر اس کی معاش کو کسی ایسے کام سے وابستہ کر دیتی جس کا براہِ راست تعلق اس کے فن اور اس کی علمی دلچسپیوں سے ہوتا تو شاید وہ بہت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنا کام کر سکتا۔ لیکن چونکہ وہ ناسازئ حالات اور آلامِ روزگار کا شکوہ کرنے اور اسے اپنی بے عملی کے لئے جواز بنانے کا قائل نہیں۔ اس لئے اس نے اپنی مصروفیات اور مشاغل کو اس طرح منضبط کر لیا ہے کہ اپنے حالات کے اندر رہتے ہوئے کام کیا جا سکے۔ خالد کی فن سے محبت ہی کا ایک کرشمہ ہے کہ اس نے اپنی جسمانی زندگی کو بھی ایک مضبوط اور بے لچک شکنجہ میں کس رکھا ہے۔ وہ اپنی جسمانی و ذہنی توانائی برقرار رکھنے کے لئے نہایت باقاعدہ زندگی گزارتا ہے۔ صبح کی سیر اور ورزش اور اکثر اوقات شام کی چہل قدمی اس کا معمول ہے۔ یوگا سے اس کی دلچسپی بھی دراصل اس کی اسی خواہش کا ایک مظہر ہے کہ مقصدِ حیات کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ جدوجہد کے قابل بنایا جائے۔ چونکہ سنّت اللہ یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کی دستگیری کی جائے۔ اس لئے قدرت نے خالد کو اس کے اخلاص اور اس کی ریاضت کا بدلہ اس صورت میں دیا ہے کہ اسے ایک تندرست و توانا جسم اور بیدار و مستعد ذہن عطا کیا ہے۔ خالد اُن معدودے چند لوگوں میں سے ہے جنھوں نے ذہنی اور اعصابی کھچاؤ کے اس دور میں کبھی سکون بخش دواؤں کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کبھی نیند آور گولیاں نہیں کھائیں۔ اس کے اعصاب ہر قسم کے دباؤ اور حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ خالد کی یہ کیفیت اس کی شعوری کوشش اور اس کے صحت مند ذہنی رویہ کی وجہ سے ہے۔ ورنہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ خالد کو زندگی کی مشکلات اور مسائل اور ذہنی تفکّرات اور جذباتی صدمات کا حصّہ معمول کے مطابق ملا ہے اور گوناگوں نامساعد حالات سے اسے سابقہ پیش آیا ہے۔ لیکن فن کی محبت اور ذہنی رویّے نے اسے ان

حالات کے آگے سپر انداز ہونے سے بچا لیا ہے۔ قدرت چونکہ اخلاصِ عمل کی قدردان ہے اور کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتی۔ اور خالد کا اس حقیقت پر ایمان حق الیقین کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے اب تک قدرت نے خالد کو اس کے اخلاص کا بدلہ اپنے فن میں نمایاں کامیابی کی صورت میں دیا ہے اور تائیدِ ایزدی سے اب تک وہ اتنا کام کر چکا ہے جو اسے اردو ادب کی تاریخ میں ایک لازوال مقام کا حامل بنا چکا ہے۔ چونکہ خالد کا ذہنی و فکری اور فنّی ارتقا تیزی سے جاری ہے۔ اور وہ نئی نئی رفعتوں کو چھو رہا ہے۔ اس لئے اُمید کی جا سکتی ہے کہ فضلِ ربی اس کے شاملِ حال رہا تو آنے والے سالوں میں وہ دُنیا کے ادبی و شعری اور فکری و علمی سرمایہ میں مزید گراں قدر اضافے کرنے میں کامیاب ہوگا۔ خالد ایسے سچے فن کار کو ضائع کرنے یا اس کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع نہ دینا قدرت کا طریقہ نہیں۔ خالد نے قدرت کی دستگیری کا مستحق بننے کی تمام شرائط پوری کر دی ہیں۔ یقیناً ادھر سے بھی اس پر نوازشات کی بارش جاری رہے گی۔ اور ــــ فن و ادب اور شعر کی دُنیا میں وہ منفرد مقام حاصل کر کے رہے گا جس کا واقعی وہ مستحق ہے!

سیّد مقصود زاھدی

دِگر دانائے راز

کسی بھی شخصیّت کے کارناموں اور فن کار کے تخلیقی مقام کا تعیّن کرنے کے لئے نقّاد اور مبصّر اس بات کے آرزو مند ہوا کرتے ہیں کہ وہ اُس فن کار یا شخصیّت سے دُور ہٹ کر اُن کے فن کو اور اس کی شخصیّت کو جانچیں، اِسی لئے سر سیّد کا خاکہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا تھا کہ کسی اچھی تصویر کی خُوبیاں پرکھنے کے لئے دُور سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وکٹر ہیوگو نے والٹیئر پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا تھا "زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم کیوں نہ ہو۔ لیکن تاریخ اپنے فیصلے کے لئے ہمیشہ موت کی منتظر رہتی ہے۔" اور یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ زندہ لوگوں کے بارے میں لکھتے وقت ہم اپنی مخصوص پسند و ناپسند، گروہی تعصّبات اور شخصیّت سے ذاتی تعلّقِ خاطر کے باعث اُس کی بنیاد محبّت پر ہو یا نفرت پر، جو رائے قائم کرتے ہیں۔ اُس میں توازن اور اعتدال کی راہ سے اکثر بھٹک جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس جب ہم کسی ایسی شخصیت پر لکھتے ہیں جو اَب دُنیا میں نہیں ہے تو اُس کے بارے میں جو معلوم مواد ہم جمع کرتے ہیں، اُسے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی لوگ جو مرنے والے کی زندگی بھر بُرائیاں کرتے رہے وہ ایکا ایکی اُس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں وہ زندگی جو راہ میں حائل ہوتی رہی، ایک طرف ہٹ کر لوگوں کو حقیقت بیانی پر مجبور کر دیتی ہے۔

لیکن بعض خوش نصیب انسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے صحیح مقام کا تعیّن ان کی زندگی ہی میں ہو جاتا ہے، اور پھر آنے والے دَور کے نقّادوں اور مبصّروں کو ان کی شخصیّت پر تحقیق و تنقید کرنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوتی۔ ایسے حضرات بہت کم ہوتے ہیں۔ مگر ہوتے ضرور ہیں۔ ایسے ہی خوش قسمت انسانوں میں سے ایک اردو زبان کے نہایت پُرگو اور معروف شاعر عبدالعزیز خالدؔ بھی ہیں۔

جب کبھی جوش ملیح آبادی کے شاعرانہ اوصاف کا ذکر چھڑتا ہے تو میں کہا کرتا ہوں کہ جوش نے اتنا لکھا ہے کہ جب آنے والے دور کے نقاد اُن کے کلام سے رطب و یابس علیحدہ کر کے دیکھیں گے تو بھی انہیں اتنا کچھ مواد اُن کی شاعری میں مل جائے گا جس کی بنیاد پر وہ انہیں اپنے عہد کا بڑا ہی قادر الکلام اور خوش گو شاعر کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کبھی وہ اُن کی نظموں کو اُن کی عظمت کی بنیاد بنانے پر مجبور ہوں گے تو کبھی ان کی رباعیات کو، اور کبھی اُن کے ابتدائی دور کی غزلوں کا انتخاب کریں گے۔ مختصر یہ کہ وہ انہیں فراموش نہیں کر سکتے۔ اور یہی اُن کی عظمت کا ثبوت ہو گا۔ ایسے ہی عبدالعزیز خالد بھی اُن شعرا میں سے ہیں کہ اُن کی شاعری کی متعدد صورتیں ہیں، اور جب آپ اُن کے متعدد مجموعوں کو، جن میں اُن کے تراجم بھی آجاتے ہیں، پیشِ نظر رکھ کر اُن کے گوناگوں محاسن کو دیکھتے ہیں تو جوش ہی کی طرح آپ کو یہ کہنا پڑ جاتا ہے کہ عبدالعزیز خالد اپنے کلام کی ندرت اور بہتات دونوں کے باعث تاریخ ادب میں اپنا مقام محفوظ رکھ سکیں گے۔

عبدالعزیز خالد کے بارے میں یہ خیالات میرے ذہن میں خواہ مخواہ پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کا ایک باقاعدہ ذہنی پس منظر ہے۔ میں عبدالعزیز خالد صاحب سے بہت بعد میں ملا۔ پہلے تو میں اُن کی شاعری ہی سے متعارف ہوتا رہا۔ اردو ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے خالد کے کلام کی عجوبہ کاری نے بارہا میری توجہ کا دامن اپنی طرف کھینچا۔ کبھی میں نے اُن کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ وہ بڑے ذی علم شاعر ہیں اور ان کا ذہنی لگاؤ عالمی ادب سے بہت گہرا ہے۔ کبھی ان کی عربی دانی اور لغت نگاری سے مرعوب ہو کر میں نے ان کو سخت اور ادق شاعر گردانا ـــــ اور یہ سوچا کہ آگے چل کر خود ہی سہل نگاری پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب شاعر کے دل میں اپنا پیغام اور اپنا کہا ہوا دوسروں کے دلوں میں بٹھانے کا خیال دامنگیر ہو جاتا ہے تو وہ خود ہی آسان کہنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور آسان کہنا ادق کہنے سے بہت مشکل کام ہے۔ عبدالعزیز خالد کی یہی ادا دل کو بھا گئی کہ وہ ہر صنفِ شعر پر حاوی ہے۔ غزل، قطعہ، رباعی، آزاد نظم، پابند نظم، مثنوی اور اب شاید منثور شاعری بھی۔ وہ کہیں بھی تو عاجز نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ وہ تمثیل نگاری بھی کرتا ہے۔ ایسے شاعر کو ادق نگار یا کوئی اور نام دے کر

آگے بڑھ جانا ایک دیانتدار قاری کے بس کی بات ہرگز نہیں ہوتی۔ اور میں بھی ایسا نہ کر سکا۔

سب سے پہلے خالد کے جس مجموعۂ کلام کا میں نے مطالعہ کیا وہ "فارقلیط" تھا۔ تمام کتاب کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ "فارقلیط" اردو کی شعری دُنیا میں ایک عجیب کارنامہ ہے۔ جب ہیئت، موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کوئی نئی تخلیق معرضِ وجود میں آتی ہے تو دماغوں کو ایک دھچکا سا لگتا ہے۔ ہم جس چیز کے عادی نہیں ہوتے اُسے ہضم کرنا تو درکنار، چکھنا بھی ہم پر بار گزرتا ہے جب اردو کی دُنیا میں ن۔م۔ راشد۔ میرا جی اور فیض احمد فیض آزاد نظم کی تکنیک اور ہیئت لے کر وارد ہوئے تھے تو بڑے بڑے ذہین انسانوں نے نظمِ آزاد کا مذاق اڑایا تھا۔ کئی اچھی نظموں کی تو پیروڈی کی گئی تھی۔ لیکن جب قارئینِ ادب کے اذہان آزاد نظم کی رَو میں بہنے لگے اور اس کے عادی ہو گئے تو اچھے اچھے پابند نظم نگار اور غزل گو شاعر بھی آزاد نظموں میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ میں نے جب "فارقلیط" اور بعد ازاں "منحمنا" کو پڑھا تھا تو شاعر کی قادر الکلامی اور علم و فضل کا اعتراف کرنے پر تو میں مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے اُن کا اسلوبِ بیان بڑا ہی عجیب اور گڈھب سا معلوم ہُوا تھا اور یہ کہنے میں مجھے کوئی تامّل نہیں کہ ان کی تخلیقات کا بیشتر حصّہ میری رسائی سے باہر ہونے کے سبب میرے اوپر سے گزر گیا تھا۔

اس کے بعد یوں ہی رفعِ حیرت کے لئے جب کبھی کسی رسالے میں عبدالعزیز خالد کا کلام دیکھتا تو اُسے پڑھتا۔ یہ جاننے کے لئے کہ وہ اسی اپنی روشِ خاص پر گامزن ہیں۔ اسی قاموسی زبان میں اپنی تخلیقات کو جنم دے رہے ہیں یا اُنھوں نے اپنے اسلوبِ نگارش میں کوئی تبدیلی لانے کی شعوری کوشش بھی کی ہے؟

اس زمانے میں عبدالعزیز خالد کا کلام مجھے جہاں بھی میسّر آجاتا میں اسے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ کئی بار تو ایسا بھی ہُوا کہ اس ادبی رسالے میں خالد کی بھی کوئی نظم یا غزل یا رباعیات شائع ہوئیں، اور میری رباعیات نے بھی اُسی میں جگہ پائی۔ یوں خواہ مخواہ اُن کے کلام سے استفادے کا موقع میسّر آتا گیا۔ "سیّارہ" کے ضخیم خالد نمبر کو پڑھ کر تو میں دنگ رہ گیا۔ پھر اتفاقیہ شاہد احمد دہلوی کے رسالہ "ساقی"

میں عبدالعزیز خالد پر ایک مختصر سا مضمون پڑھا اور میں نے طے کر لیا کہ خالد صاحب سے ضرور ملوں گا تاکہ ان کی شخصیت کا کچھ تو اتہ پتہ معلوم ہو، کچھ تو اور چھور ملے۔

جو یندہ یابندہ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ ایک دن اچانک وزیری پانی پتی صاحب سے ملاقات ہو گئی، پوچھا کہاں کا ارادہ ہے تو کہنے لگے۔ عبدالعزیز خالد صاحب آئے ہوئے ہیں، انہی سے ملنے جا رہا ہوں۔ اشتیاقِ ملاقات تو تھا ہی، میں نے موقع کو غنیمت جانا اور ان سے کہا چلئے میں بھی آپ کے ہمراہ چلتا ہوں۔

یوں میں وزیری صاحب کے ہمراہ چل تو پڑا۔ لیکن راستے میں مسلسل ایک مخمصے کے عالم میں رہا۔ کہ عبدالعزیز خالد ایک وسیع و عمیق عالم، شاعری کے میدان میں یکہ تاز، منفرد شاعر، میں تو یہی کبھی کبھار شوقیہ شعر کہنے والا وہ بھی رباعی جیسی مشکل صنف میں۔ خالد ٹھہرے دنیا جہان کے دیومالائی ادب کے اُستاد، اساطیری ادب پر حاوی، میں آخر اُن سے کیا باتیں کروں گا۔ اس شخص سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے، ایک شخص ہفت زبان، ماہر السنہ نہ سہی، اُسے عربی، فارسی اور ہندی میں تھوڑی بہت تو شُدبُد ہو، نہ سہی عبرانی، سنسکرت اور سریانی جیسی زبانوں میں، لیکن پھر خیال آیا کہ دو ملنے والوں کے لئے یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ ان کے علم کی سطح بالکل ہی برابر ہو، آخر ہم میوزیم بھی تو دیکھنے جاتے ہیں۔ کتب خانوں کی بھی تو سیر کرتے ہیں۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہم میوزیم میں موجود ہر شئے کے بارے میں کُلّی واقفیت یا شعور بھی رکھتے ہیں۔ یا پھر کسی عظیم کتب خانے کی ہر کتاب اور اس میں رکھے ہوئے تمام قدیم و جدید مسودات کی تمام نزاکتوں اور گہرائیوں سے بھی واقف اور باخبر ہوتے ہیں۔ بہت سی باتیں تو ہم محض اپنے جذبۂ حیرت کی آسودگی کے لئے کرتے ہیں۔

پھر میں نے سوچا کہ اگر اور کچھ نہیں تو عبدالعزیز خالد کے کلام میں ایک وصف تو پایا ہی جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص صرف ایک ہی فرد کے ادبی کارناموں کو پڑھ کر عالم فاضل بننے کا متمنی ہو اور وہ دُنیا جہان کی باتوں کے رموز سے آشنا ہونا چاہتا ہو تو کتنی سہل سی بات ہے کہ وہ عبدالعزیز خالد کے مجموعہ ہائے کلام کو لے کر بیٹھ جائے۔ اور یہ بات کچھ کم تو نہیں ہے اور مجھے ایک بات یاد آگئی۔

یوسف ظفر صاحب نے مجھے ایک دفعہ کا واقعہ خود سنایا تھا کہ جب وہ غالباً رسالہ "ہمایوں" کے مدیر تھے تو عبدالعزیز خالد صاحب نے اپنی کوئی نظم یا غزل انہیں برائے اشاعت بھیجی تھی، جسے انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا تاکہ "ہمایوں" میں عربی کلام شائع نہیں ہوتا۔ اس میں صرف اردو کلام شائع ہوتا ہے۔ یہاں یوسف ظفر نے یہ بات تفننِ طبع کے لئے سنائی تھی۔ وہاں ذرا شرمندہ بھی تھے۔ کیونکہ وہ اُس وقت کے عبدالعزیز خالد اور اب کے عبدالعزیز خالد کے علم اور مرتبے اور فرق کو سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی خالد کی تہ در تہ فطانت (GENIUS) کا انکشاف اس کی رنگارنگ تخلیقات سے جو ہو رہا تھا۔ اس سے بھلا کون صرفِ نظر کر سکتا ہے۔

یوں ہی پیچ و تاب کھاتا وزیری صاحب کے ساتھ میں ملتان کے اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر جناب ضیاء الرحمٰن صاحب کے دفتر میں پہونچ گیا۔ اور چند ہی منٹ انتظار میں صرف کئے ہوں گے کہ طلبی ہو گئی اور میں عبدالعزیز خالد کے روبرو تھا۔ نگاہ پڑی تو بڑے تیکھے نقوش کے خوش وضع اور نستعلیق سے انسان نظر آئے، اُن کے چہرے مہرے سے مردانہ وجاہت بھی اور افسرانہ وقار اور تمکنت بھی ٹپکتے تھے۔ سُتواں ناک اور بڑے ترشے ترشائے خطوط، ایسے کہ اُن میں حُسن بھی تھا اور بانکپن بھی۔ رکھ رکھاؤ بھی نظر آتا تھا اور گھُل مل جانے کی سادہ تمنّا بھی۔ غرض عبدالعزیز خالد مجھے دیکھنے اور ملنے کی چیز نظر آئے۔

اُنہوں نے بڑے ہی پُر تپاک انداز میں مصافحہ کیا، مجھ سے بھی اور وزیری صاحب سے بھی۔ جو اُن کے محکمے ہی کے ایک اہلکار   کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وزیری صاحب حفظِ مراتب کے خیال سے اِدھر اُدھر بیٹھنے میں ذرا سے کسمسائے بھی، لیکن خالد صاحب کے اشارے پر اُنہیں ان کے عین روبرو بیٹھتے ہی بنی۔ اور یوں قلم کے رشتے نے مرتبوں کا فاصلہ کم از کم عارضی طور پر تو ختم کر دیا۔

میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ خالد صاحب نے مجھے چونکا دیا۔ "زاہدی صاحب، آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ آپ نے خاکے تو بہت لکھے ہیں خاکے، اور آپ رباعیات بھی تو کہتے ہیں رباعیات!"

خالد صاحب نے رباعیات کے لفظ کی تکرار کی۔ مزید باتیں ہوئیں تو مجھ پر کھلا کہ خالد صاحب اپنی گفتگو کے ہر جملے کے کسی نہ کسی لفظ پر زور دینے کے لیے، اُسے دو تین بار ادا کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ عادتِ ثانیہ بن کر رہ گئی ہے۔ خالد کی شخصیت کے مطالعے میں ان کا یہ عجزِ اظہار اُن کی بڑی من موہنی سی ادا معلوم ہوئی۔ اور مجھے برّصغیر پاک و ہند کے ایک بلند مرتبہ ادیب، اُستاد اور دانش ور ڈاکٹر عابد حسین یاد آ گئے، جو باتیں کرتے کرتے اپنی ہکلاہٹ سے عاجز آتے تھے تو تا دیر ایک ایک لفظ کی ادائیگی کے لیے سخت کرب کے عالم میں نظر آتے اور اُن کے سامع کے لیے اُن کی یہ بیچارگی بڑی ہی تکلیف کا باعث ہوتی۔ میں تو ایسے نازک لمحات میں اپنی نگاہیں نیچی کر لیا کرتا تھا تاکہ ان پر بار نہ ہوں۔ لیکن عبدالعزیز خالد کے لہجے میں تو صرف خفیف سی لکنت ہے۔ جس پر وہ آخری لفظ یا درمیانی کسی لفظ کی تکرار کر کے غالب آ جاتے ہیں۔ اور یوں خیالات کے اظہار میں یہ معمولی سی رُکاوٹ کبھی حائل نہیں ہوتی۔ اور قلم کے ذریعے تو خالد نے اتنا اظہار و انکشافِ ذات کیا ہے جو طلاقتِ لسانی اور قلمی دُنیا کے مالک کئی عمروں میں بھی شاید نہ کر پاتے۔

"جی ہاں، رباعی کہنے کا شوق تو ہے۔ میرے والد نے مجھے بہت چھٹ پن میں اپنے پہلو میں لٹا کر اور گود میں بٹھا کر میر انیس اور مرزا دبیر کی کچھ رباعیات یاد کرا دی تھیں، بس رباعی کا وہ سانچہ دماغ میں بیٹھ گیا۔ جب طبیعت موزوں ہوتی ہے تو خیالات و افکار از خود رباعی کا روپ دھارنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"خوب خوب، تو پھر سنائیے کچھ رباعیات، رباعیات!"

میں نے ان کے اس لفظ کو دُہرانے کا دل ہی دل میں مزا لیا۔ ان کی افسرانہ خُو میں ایک شاعر اور ادیب کی بے نیازی کی شان مجھے گھُلی ملی سی نظر آئی۔ میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ مجھ سے جتنے دُور ہیں اُتنے نزدیک بھی ہیں۔ کم از کم ہمارے احساسات کے تار تو یکساں طور پر جھنجھناتے ہیں، واقعات و حالات تو ہمیں ایک ہی انداز میں متاثر کرتے ہیں۔

خالد صاحب کی سادہ مگر پُر وقار گفتگو سے میں محظوظ ہوا۔ اُن کی سادگی اور بے نیازی

میں ان کے مقام و منزلت کے وقار اور تمکنت نے داخل ہو کر ان کی شخصیت کو خاصا پرکشش بنا دیا ہے۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنا کلام بھی سنائیں۔ لیکن وہ دانستہ ٹال گئے۔ شاید دفتر کے ماحول کو انہوں نے اس کے لئے موزوں نہ سمجھا ہو۔ ضیاء الرحمٰن صاحب نے چائے منگوائی تھی۔ ہم سب نے ایک ایک پیالی پی اور جب تک چائے چلتی رہی باتوں کا دور بھی چلتا رہا۔ جب ہم نے رخصت طلب کی تو خالد صاحب نے کہا

"کبھی لاہور آئیں تو ملئے"

مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی، جب کبھی لاہور آؤں گا تو آپ سے نیاز ضرور حاصل کروں گا۔ جب میں خالد صاحب سے مل کر باہر آیا تو دیر تک سوچتا رہا کہ قلم کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ احساس و شعور کے اس عالم میں سارے اونچ نیچ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک نوع کا حلقہ ہوتا ہے۔ جیسے صوفیا کا۔ کہ وہاں دنیاوی جاہ و جلال اور چھوٹائی بڑائی سب فرق مٹ جاتے ہیں اور پھر میں دیر تک وزیری صاحب سے خالد کی تصانیف منمنا، فارقلیط، سلومی اور غزل الغزلات وغیرہ پر باتیں کرتا رہا۔

خالد کتنا بڑا عالم ہے۔ کتنی ادق زبان استعمال کرتا ہے۔ کیسا عجیب اسلوب نگارش ہے۔ کس قدر بھرپور اور رنگا رنگ ہے اس کی شاعری:-

میں جب بھی خالد کو پڑھتا ہوں تو مجھے نظیر اکبرآبادی خواہ مخواہ یاد آجاتا ہے نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں جتنے الفاظ استعمال کئے ہیں، اُتنے شاید کسی نے بھی نہیں کئے۔ عبدالعزیز خالد اور نظیر میں یہ ایک بڑی قدرِ مشترک ہے۔ دوسری بات جو نظیر اکبرآبادی اور خالد میں مجھے نظر آئی، وہ یہ کہ نظیر اپنی شاعری میں ٹھٹھول کے در آنے کو نہیں روک سکتے۔ اور خالد اپنی شاعری میں اپنی علمیت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گویا نظیر کی چٹکلے بازی اور خالد کا علم و فضل ان کے مابہ الامتیاز اوصاف شاعری بن گئے۔ بہرحال اگر غالب کی شاعری اُن کے ہمعصروں کے لئے چیستان بن گئی تھی، اور خالد اپنے ہمعصروں سے نالاں ہیں تو اس میں نہ غالب قصوروار تھے اور نہ خالد۔ لیکن ان کے پڑھنے

والے بھی کچھ کم بے قصور نہیں ہیں۔ اس افراتفری کے عالم میں اگر کوئی صرف اپنی مادری یا قومی زبان ہی کو آدھا تہائی جانتا ہے تو یہ بھی غنیمت ہے۔ ہفت زبان بننے کے وسائل اور دماغ، لوگ کہاں سے لائیں؟

خالد صاحب سے دُوسری ملاقات اُن کے لاہور کے عالی شان دفتر میں ہوئی تھی۔ یہاں وہ ملتان سے بھی بڑے افسر نظر آرہے تھے۔ جب میں پہونچا تھا تو وہ اپنی اسٹینو کو کچھ ڈکٹیٹ کرا رہے تھے۔ میں خاموش بیٹھا اُن کی رواں اور شُستہ انگریزی کی داد دیتا رہا۔ وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو ایک اور صاحب تشریف لے آئے۔ یہ غالباً کوئی کاتب تھے، وہ بڑے نرم نرم لہجے میں اُنہیں اپنا کام سمجھاتے رہے، اِس دوران اُن کی ایک تصنیف جو بے جلد اور سرورق سے بے نیاز ان کی میز پر پڑی تھی۔ انہوں نے اُٹھائی اور مجھے تھماتے ہوئے کہا "آپ نے اس کو ملاحظہ کیا ہے؟"

"زنجیرِ رمِ آہو" میں نے اُن سے لے لی۔ اور جب تک وہ کاتب سے مصروفِ گفتگو رہے میں اُسے دیکھتا رہا۔ کتاب کا میں بھی بڑا دُشمن ہوں۔ ان معنوں میں کہ بس نظر آجائے، پسند آجائے پھر جی چاہتا ہے کہ بس وہ مجھے مل جائے۔ چنانچہ وہ میری طرف ذرا متوجہ ہوئے تو میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

"یہ آپ مجھے دے دیجئے۔ اس کی بیشتر نظمیں میری سمجھ میں آرہی ہیں اور میرے ذہنی معیار کے مطابق معلوم ہوتی ہیں۔"

"اچھا اچھا" خالد صاحب مسکرائے۔

"میں پڑھ کر آپ کو لوٹا دوں گا"

"اس کی میرے پاس کوئی اور کاپی نہیں ہے اور اسے دوبارہ چھپوانے کی سوچ رہا ہوں، اچھا لے جائیے، لے جائیے!" اور انہوں نے خندہ پیشانی سے کتاب میرے حوالے کر دی۔

اُن کی شاعری کے تنوع اور انوکھے پن کی اب تو ایک عادت سی ہوگئی ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں نے خالد کے بارے میں یہ محسوس کیا ہے کہ وہ جب بھی کسی کی نئی تخلیق کو دیکھتے ہیں یا کوئی

اچھا فن پارہ ان کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایسا تو وہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی تیور امیر خسرو کے بھی تھے۔ جہاں نظامی کا خمسہ یا حافظ اور شیخ سعدی کی کوئی مرصع غزل اُن کے سامنے آئی اور انہوں نے بجوابِ آں غزل ایک خوبصورت اور حسین سی نئی غزل کہہ دی اور خمسۂ نظامی کا تو انہوں نے جوابِ لاجواب لکھا۔

ایک دن امیر خسروؒ اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدینؒ سے کہنے لگے "میں گلستاں بوستاں کا جواب لکھوں گا۔" اُن کے مُرشد بات کو ٹال گئے۔ انہوں نے اپنے روشن ضمیر پیر کے سامنے پھر یہی بات دُہرائی اور وہ پھر طرح دے گئے۔ ایک موقع پر امیر خسرو اپنی بات پر اڑ گئے اور بولے۔ "یا حضرت! کیا آپ کی دانست میں آپ کا خسرو گلستاں بوستاں کا جواب نہیں لکھ سکتا؟" تب حضرت خواجہ نظام الدینؒ مسکرائے اور انہوں نے فرمایا۔ "خسرو! تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے انعامات سے نوازا ہے۔ تمہیں اعلیٰ ترین ذہانت اور ذکاوت کی دولت میسر آئی ہے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر بات کا جواب ہی لکھا جائے۔ تم اور بھی تو بہت کچھ لکھ سکتے ہو۔ جہاں تک گلستاں بوستاں کا سوال ہے اس کا جواب رہتی دُنیا تک کوئی نہ دے سکے گا۔ وہ اپنا جواب آپ ہیں!"

امیر خسرو اپنے مرشد کا مطلب سمجھ گئے۔ اور آئندہ انہوں نے کبھی کوئی جواب لکھنے کی طرف توجہ نہ کی۔ اس مثال سے میرا مدعا یہ جتانا نہیں ہے کہ عبد العزیز خالد بھی لوگوں کا جواب ہی لکھنے کے آرزومند رہتے ہیں، ہرگز نہیں۔ میں تو یہ جتانا چاہتا ہوں کہ ایک مدت میں ایک ایسا شاعر اردو زبان نے پیدا کیا ہے جو ہر طرح کی شاعری پر قادر ہے اور ہر صنف ادب میں اظہار خیال کر سکتا ہے۔ ——— میری دانست میں اردو ادب کے جو چند بڑے نعت گو ہیں، اُن میں سے ایک عبد العزیز خالد بھی ہیں۔ امیر مینائی، محسن کاکوروی، مولانا نیاز شاہ بریلوی، اور ظفر علی خاں کے بعد عبد العزیز خالد کا مقام بحیثیت نعت گو بہت بلند ہے۔ اور ایک اعتبار سے وہ ان سب سے منفرد ہیں کہ اُن کی نعتیں روایتی انداز سے بالکل ہٹ کر ہیں۔ "منحمنّا" اور "فارقلیط" جیسی طویل نظمیں جن میں ارتقائے

آدم کے فلسفے کو پیش کر کے کمالِ آدمیت کا منتہا رسولِ مقبولؐ کی ذات کو دکھایا گیا ہے۔ شعری ادب میں بہت بلند مقام رکھتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی تخلیقات اُن کے علم و فضل سے اس قدر بوجھل ہو گئی ہیں کہ عام قاری کی رسائی سے وہ باہر ہیں۔ اُن کی یہ تخلیقات پڑھ کر میرے ذہن میں ہمیشہ اے کاش، اے کاش آتا رہا ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ عبدالعزیز خالدؔ نے اردو ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ جب اُن کے کلام کا انتخاب شائع ہو گا تو وہ بہر حال دوسرے کم گو اور کم محنتی شعرا پر سبقت لے جائیں گے۔ اگرچہ ابھی تو خالدؔ کو اور بھی نہ جانے کتنا کچھ لکھنا ہے۔ لیکن اگر آج تک کا اُن کا کہا ہوا سمیٹا جائے اور اُس کا انتخاب کیا جائے تو وہ بڑے بڑے نامی گرامی شعرا کو پیچھے چھوڑ دیں گے۔

خالدؔ جن لوگوں سے ایک بار مل لیتے ہیں اُن پر ایک ایسا اثر چھوڑتے ہیں کہ اُن سے دوبارہ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگرچہ خالدؔ سے ملتے وقت ہمیشہ ایک تکلّف اور جھجک دامن گیر ہوتی ہے۔ لیکن اسے خالدؔ خود ہی دُور کر دیتے ہیں۔ اگر خالدؔ محض انکم ٹیکس کمشنر ہی ہوتے اور اُن کے اندر کا فن کار اظہارِ ذات کے لئے بے تاب نہ ہوتا تو نجانے کتنے شاعر اور فن کار اُن سے ملنے کا کبھی تصوّر بھی نہ کرتے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ خالدؔ کے ساتھ ملتان میں شام منائی گئی تھی۔ میری بیگم کی طبیعت اُس دن بہت ناساز تھی، چنانچہ میں باوجود خواہش کے بھی اُس شام اُس تقریب میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن میں نے اپنی معذوری اور مصروفیت کا عذر خالدؔ صاحب تک پہنچا دیا تھا۔ اُس کے بعد جب خالدؔ ملتان آئے تو انہوں نے میری معذوری اور عدم شرکت کو یاد رکھا۔ چنانچہ وزیری صاحب کے ذمے لگا دیا کہ وہ مجھے لے کر ہوٹل پہنچیں جہاں اُن کے احباب نے اُن کے ساتھ چائے کی ایک نشست کا اہتمام کیا تھا۔

اتوار کی شام تھی، مجھے بھی فرصت تھی، چنانچہ میں مقررہ وقت پر ہوٹل جا پہنچا، جہاں خالدؔ صاحب اپنے احباب کے درمیان موجود تھے۔ حُسین سحر صاحب، وزیری صاحب، سرورؔ بجنوری صاحب، اصغر علی شاہ، رفیع انور صاحب، حاتمی کرنالی صاحب اور ان کے دیگر احباب دیر تک چائے، کیک اور بسکٹوں کے

شغل کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی ادبی اور غیر ادبی باتیں ہوتی رہیں۔ اور سب محظوظ ہوتے رہے۔ اُس شام بھی خالد صاحب نے نہ تو دُوسروں ہی سے کلام سننے کی فرمائش کی اور نہ ہی اپنا کلام سُنایا۔ وہ جہاں ایک طرف ہر شخص سے ملنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھنچے کھنچے بھی رہتے ہیں۔ یہ کشاکش اور یہ ذہنی پیچ و تاب اُن کے اپنے معاشرتی مقام اور افسرانہ رکھ رکھاؤ کے احساس سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ جہالت گریزی بھی اس کا ایک سبب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ خود اس ذہین و فطین شاعر کا وہ کربِ باطنی بھی اس کا باعث ہو سکتا ہے۔ جس میں یہ ہمہ وقت مبتلا رہتا ہوگا۔ یوں خالدؔ "انجمن انجمن رہے تنہا" کا مصداق نظر آتا ہے۔ اور یہی تنہائی خلاق رہے اُن مضامین کی، جو پیہم اُس کی تخلیقات سے آشکار ہوتے ہیں۔

خالد بہت خلاق، بہت منفرد، بہت بڑا نظریاتی شاعر ہے۔ وہ بہت ہی کٹر پاکستانی ہے اور میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ علامہ اقبالؔ کو جو آخری عمر میں یہ فکر دامن گیر تھی کہ ؏

"دگر دانائے راز آید کہ ناید"

کہیں خالدؔ کی صورت میں وہ دانائے راز آ ہی نہ چکا ہو۔ ابھی تک خالدؔ نے اپنا پیغام جو اس کے کلام میں بین السطور پایا جاتا ہے، عام کرنے کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز نہیں کی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنا خونِ جگر جلا کر کبھی اِک انجمن سجائی تھی۔ جس میں انہوں نے اپنے ارد گرد بہت سے راز داں اکٹھے کر لیے تھے۔ انہی راز دانوں نے اقبالؔ کا پیغام ہاتھوں ہاتھ لے کر پاکستان تخلیق کر ڈالا اب حالات بدل چکے ہیں۔ وہی مٹی جس میں انقلابی جدوجہد کے خون سے نمی آچکی تھی اب پھر خشک ہو چکی ہے۔ اور اب نئے پیام کی ضرورت ہے۔ ارضِ پاکستان ایک نئی اُمنگ اور نئے جذبے کی متمنی ہے۔ یہ پھر کسی بڑے فن کار کے خونِ جگر کی طلبگار ہے۔ خالدؔ یقیناً اسلامی تہذیب و تمدن کا پیامی بننے کا اہل ہے۔ وہ مشرق و مغرب دونوں کے مزاج سے بھرپور آگہی رکھتا ہے۔ اُس میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو ایک دانائے راز میں ہونے چاہئیں بلکہ اس میں کچھ اضافی خُوبیاں بھی ہیں جو اُسے کُل انسانیت کا پیامی بنا سکتی ہیں۔ بس اتنی سی بات رہ جاتی ہے کہ اُس کا کلام سہل بھی ہو تو اُسے

خواص ہی نہیں عوام بھی سمجھ سکیں۔ اور کیا عجب کہ عبدالعزیز خالد اب خود بھی اپنے پیام کو عام کرنے کے لئے اسی نہج پر سوچتے ہوں۔ اور وہ دن نزدیک ہوں جب اُن کا کلام پڑھ کر خاص لوگ ہی نہیں بلکہ عام انسان بھی جھوما کریں گے!

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

مُخترع نعت نگار

خالدؔ کے کلام کا عمومی مزاج اِن معنوں میں اسلامی ہے کہ اس نے اپنی نظموں میں اسلام اور تاریخ اسلام کی عظمت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ لیکن یہ حجازی لَے سب سے زیادہ اس کی نعتوں میں منعکس ہوئی ہے۔ اس وقت فارقلیطؔ اور منحمنّاؔ کے نام سے اس کی دو طویل نعتیں ہمارے سامنے ہیں۔

نعت کا فن نیا نہیں۔ اس کا آغاز خود زمانۂ رسولِ پاک میں ہو چکا تھا۔ کعب بن زُہیرؓ، لَبیدؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور حسّان بن ثابتؓ سب سے بڑے اور اوّلین مدّاحِ رسولؐ تھے۔ ان کے بعد عربی، فارسی، ترکی اردو (بلکہ بہت سی اور زبانوں) میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور اب بھی جاری ہے۔ اس سارے عرصے میں نعت کا فن مختلف صُورتوں میں نمودار ہوتا رہا۔ اور نعت نگاری کے متعدّد طریقے ایجاد ہوئے۔ ان میں ایک طریقہ حسّان بن ثابتؓ کا ہے۔ ایک طریقہ خاقانی کا ہے۔ ایک طرز جامی کی ہے۔ ایک انداز حافظ کا ہے جس میں غزل کے انداز غزل کے مزاج کے مطابق رمز و ایما کے ذریعے مدحِ رسولؐ کی گئی ہے۔ اردو میں ایک رنگ شہیدی کا اور ان کے علاوہ ایک خاص رنگ محسنؔ کاکوروی کا ہے۔ پھر احمد رضا خاں، اکبر، حفیظ جالندھری، حالی ظفر علی خاں، اقبال، بہزاد، دلو رام کوثری وغیرہ اور جدید ترین نعت نگاروں (حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، اعظم چشتی، قمر میرٹھی) وغیرہ کے اپنے اپنے رنگ ہیں اور خُوب ہیں۔

بایں ہمہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خالدؔ نے نعت نگاری کا ایک اندازِ خاص ایجاد کیا ہے، اور جس طرح وہ ایک خاص الخاص اسلوب کا مُوجِد ہے۔ اسی طرح وہ نعت نگاری میں بھی مُخترع و مجتہد

ثابت ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب فارقلیط کے خاتمے میں اس کا ذکر خود کرتا ہے ؎

روایت سے تجدید کی سوت پھوٹے

وہی ہے مجدّد جو خود آشنا ہے!

چنانچہ اس مجدّدِ اسلوب نے جس طرح تعمیرِ الفاظ کا ایک نیا فن ایجاد کیا ہے۔ اسی طرح مدحِ رسولؐ کا بھی ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے۔ ایک نئی روش، ایک نئی سبک ہمیں دی ہے۔

نعت نگاری میں عمومی شدید جذباتِ محبّت سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابن الفارض نے اپنی نظموں میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے فاصلے مٹا کر عشق کی صرف ایک ہی قسم کو حقیقی قرار دیا ہے اور وہ ہے عشقِ رسولؐ۔ ابن الفارض پر ان کے استاد اور معاصر ابن العربی کی ترجمان الاشواق کا خاص اثر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا انداز بھی یہی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ نعت میں چند خاص مضامین مروّج ہیں۔ سلام درود، انسانوں اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ و تحیات۔ آپ کی اور خدا کی حقیقت میں صرف میم کا فاصلہ، خاکِ حجاز سے محبّت، مدینہ پہنچنے کا شوق، دیارِ حبیب ہی میں مر جانے کا اشتیاق کبھی سراپائے رسولؐ کا وصف، کبھی خلقِ عظیم کی تعریف وغیرہ وغیرہ۔ اور جدید تر دور میں آپ کے احسانات انسانیت پر، قومی مصائب میں امداد کی درخواست، شفاعت کی درخواست اور اس نوع کے دیگر مضامین باندھے جاتے ہیں۔

خالد کی نعت ان سب سے منفرد ہے۔ اس میں شاعر کی کوشش یا آرزو یہ معلوم ہوتی ہے کہ محبت کا ہر جذبہ، مدح و وصف کا ہر طریقہ، اظہار کا ہر پیرایہ سرورِ کائنات کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔ وصف کے ہزار رنگ پھول آپ پر نچھاور کر دیے جائیں۔ خالد نے اپنی نعتوں میں کسی جذبے کو بچا کر نہیں رکھا۔ دل کی ساری کائنات آپ کے حضور پیش کر دی ہے۔ سینکڑوں اشعار لکھے ہیں، مگر تشنگی ہنوز باقی ہے اور اقرار کیا ہے کہ ؎

کہاں نعت و تمام رسولؐ تہامی

کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

خالد کی نعت دوسری طرزوں سے یوں جدا ہے کہ اس کا دامن جذبات سے واقعات تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کا میدان وصفِ رسولؐ سے آگے بڑھ کر تاریخ اسلام کی آگے کی منزلوں تک جا پہنچا ہے۔ چنانچہ اس میں جہاں آنحضرتؐ سے متعلق واقعات ہیں، وہاں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے متعلق اذکار بھی ہیں۔ بلکہ خلافتِ راشدہ کے بعد کی خلافت اور ملوکیت اور احساساتِ اسلامی کے عروج و زوال کے تاثّرات بھی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالد کی نعت پھیل کر تاریخ اسلام اور تذکرہ مدّ و جزرِ قومی بن گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ نعت کا نیا تصوّر ہے۔

سابقتہً یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خالد کا شوقِ نعت بے تاب و بے حساب ہے۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس میں نعت گوئی کی ہر طرز کا پیوند لگا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ہندی کے عاشقانہ لہجے بھی ہیں جو محسن کاکوروی کی مشہور نعت سے زیادہ ہندی آمیز ہیں۔ خالد کی نعت میں اصنامیات کے پیوند بھی آتے ہیں اور شاعر کے شوقِ بے باک کا اظہار کر جاتے ہیں۔ جس کے لئے اُس نے خود بھی معذرت کی ہے ؎

دل ایک رندِ کافر ہے اشعار مومن | نہاں و عیاں میں عجب تفرقہ ہے
پیمبرؐ کہے انی لستُ بِشاعِر | کہ یہ مرتبہ میرے مملوک کا ہے
وہ مملوک جس کو میں کہتا ہوں خالد | جو سلطانِ اقلیم حرف و نوا ہے

"منحمنّا" کا انداز بھی یہی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس میں تعدادِ اشعار کم ہے۔ میدان بھی محدود ہے اور "فارقلیط" کے مقابلے میں اس میں ٹھہراؤ، سکون اور نغمگی زیادہ ہے۔ لیکن منحمنّا کا خاتمہ پاکستان کے لئے دُعا پر ہوتا ہے کہ اب یہی خطہ ارض، شاعر کی "حجازی" آرزوؤں کا مرکز و محور ہے ؎

یہی دُعا ہے الٰہی بنامِ پاکِ نبیؐ
دیارِ پاک رہے دائماً خوش و خرّم

منحمنّا کا نصف اوّل ثنائے خواجہؐ (نعتِ رسولؐ) پر مشتمل ہے اور نصف ثانی زمانے کے بدلے ہوئے افکار و اقدار پر تشویش سے لبریز، جس میں اپنی قلبی حالتوں پر بھی تبصرہ ہے۔ نصفِ اوّل کے

خاتمے پر ثنائے خواجہ کا حق ادا نہ ہو سکنے پر عذر پیش کیا ہے ؎

صفاتِ بوقلموں لَا تُعَدُّ لَا تُحْصیٰ

ثنائے خواجہؐ سے معذور ہیں زبان و قلم

اِس کے بعد دُوسرا باب آتا ہے جس میں ملّت کو اُمید کا پیغام دیا ہے ؎

کہو یہ غمزدہ سے لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ

ہے منزلِ احدیت کا جادہ، راہِ الم

آخری دو بابوں میں ملّت کی اخلاقی کج روی، مغرب پرستی اور بے اخلاقی کو زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ انہیں نبی اکرمؐ کے صراطِ مستقیم پر واپس آکر تجدیدِ عہد کرنی چاہیے کیونکہ دُنیا بھر کے صلیبی اور زُنّاری اُن کی تخریب کے درپے ہیں۔

منمنا میں براہِ راست شخصی غم کے حوالے بڑے پُرخلوص اور والم آمیز ہیں۔ مگر ان سب کا مُدّعا کوئی ذاتی فریاد نہیں۔ بلکہ یہ بھی قومی جذبوں کا اظہار ہے۔ ہاں اپنے لئے بھی رحمتِ پروردگار سے کچھ مانگا ہے

دُعا ہے عاجز و عاصی کی اُعْطِنِی سُؤْلِی	کہ اپنے دامنِ رحمت میں سیّات کو ضم
کمینہ خادمِ خُدّامِ عاشقانِ رسُولؐ	ہے نعت و نامِ تہی، مایۂ مباہاتم
ہے خضرِ راہ مِری، میرے دل کی موسیقی	وگرنہ مجھ کو کہاں درکِ مُغرب و مُعجم

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ خالد کی نعت کے مضمون و موضوعات سے متعلق ہے لیکن یہ یاد رہے کہ خالد کے اسلوبِ خاص کے باعث، اس کی عام نظموں کی طرح، اس کی نعتیہ نظموں کے معانی تک رسائی صرف کسی کسی کے بس کی بات ہو گی۔ اس لئے یہ اور بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خالد کی نعت کی حقیقت، مقصد اور قوتِ ابلاغ کے بارے میں خاص توجہ سے بحث کی جائے۔

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ خالد معانی سے زیادہ تاثّر (IMPRESSION) کا شاعر ہے۔ یعنی وہ قاری کو تاثّر کے راستے سے معانی تک پہنچاتا ہے۔ یہ اس کا خاص فن ہے کہ وہ قاری کو اپنی عبارتوں کے خارجی صوت و آہنگ اور الفاظ کی ظاہری شان و شوکت سے (معناً نہیں صوتاً) متوجہ کر کے، اسے

اپنے معانی کے فہم و غور و فکر کی طرف بلاتا ہے۔ جو کوئی اس کے معانی تک پہنچ گیا اسے تاثّر کے ساتھ خیالات و افکار کی دولت بھی مل جاتی ہے۔ مگر جسے خیالات و افکار سے کچھ حصّہ نہ مل سکا وہ کم از کم تاثّر سے بہرہ مند ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بھی خالد کچھ زیادہ نقصان میں نہیں رہتا۔

خالد کی اس خارا شگافی پر بعض لوگ متعجّب ہوتے ہیں۔ لیکن اجتہاد کی دُنیا میں ہر اسلوب ملتا ہے۔ خود فن کی قلمرو میں تاثّریت (IMPRESSIONISM) اور اظہاریت (EXPRESSIONISM) اور تجرید کی تحریکیں ہر کسی کے علم میں ہیں اور جدید لسانی تشکیلات کے تجربے تو اتنے انوکھے اور عجیب و غریب ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ذہنی خودکاری (AUTOMATISM) کے عجائبات سے کون واقف نہیں کہ اس کی اختراعات ربطِ منطقی تک سے بھی بے نیاز ہیں۔ خالد تو ان اختراعات میں سے کسی ایک کا بھی مرتکب نہیں ہُوا۔ وہ صرف "غیر معمولی" اور غریب و نادر اسلوب کا گنہگار ہے اس سے بے ربطی اور منطقی بدنظمی کا کوئی گناہ سرزد نہیں ہُوا۔

بہر حال خالد ایک مجتہد کی حیثیت سے "صوت کاری" اور تاثر میں اعتقاد رکھتا ہے اور اس کے واسطے سے تخیّل کو دعوتِ عمل دیتا ہے۔ اس کی یہ دعوت یوں بھی بے جا نہیں کہ وہ موجودہ دور کے قاری کی شب کور آنکھ کو ماضی کے اندھیروں کے اندر سے گزشتہ عظمت کے نقشے دکھاتا جاتا ہے۔ خالد کی نعت میں بھی صوت کاری ہے اور تاثر انگیزی کا وہی اسلوب ہے جو اس کی باقی شاعری میں ہے۔ باقی شاعری کی طرح فارقلیط اور منحمنّا میں بھی شاعر کا اسلوب چند عناصر سے عبارت ہے۔

پہلا عنصر ہے سبکِ عرب، دُوسرا عنصر ہے سبکِ اساطیری (اصنامیاتی ادبی زبان اور حکماء العرب[1] کا سا اندازِ بیان) تیسرا عنصر ہے سنگلاخ آفرینی، عظمت تراشی اور "فخامت[2] ایجادی" جو خالد کی سب کتابوں میں ہے اور جس کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

---

[1] ان میں سے اکثر سجع میں دانش کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ قبل از اسلام کے دانشمندانِ عرب تھے۔
[2] بمعنی عظمت،

سبکِ عرب کیا ہے؟ شاعری کے وہ لہجے اور زبان و بیان کے وہ پیرائے جو عرب شاعروں (خصوصاً عہدِ جاہلیت کے شعراء) کے کلام میں ملتے ہیں۔ مثلاً ریگستان میں سفر کرتے ہوئے اپنے دوستوں سے خطاب و مکالمہ، محبوبہ کی یاد، کھنڈروں اور پرانی خیمہ گاہوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا تذکرہ اور دوسرے احوال و مقامات۔ فارسی کے بہت سے شاعروں نے اپنی شاعری میں اس رسم کی تقلید کی۔ مثلاً منوچہری، سعدی، حافظ اور جامی وغیرہ نے یہ انداز بھی اپنایا۔ ہمارے ہاں میں ظفر علی خاں اور اقبال نے صرف اس حد تک رسم کا تتبّع کیا کہ انہوں نے قرآن مجید کی آیات کے اجزاء یا عرب شعراء میں کسی کے شعر یا مصرعے کی تضمین کی۔

مذکورہ شاعروں کے کلام میں عربی جملے، حدیثیں اور آیتیں بقدرِ نمک ہیں۔ لیکن خالدؔ کے یہاں نصف یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ قدرتی تھا نعت میں اس سبکِ عربی کے لئے گنجائش بقدرِ وافر موجود بھی تھی اس لئے اس کا بھرپور استعمال ہُوا ہے۔ بلکہ اس میں توسیع یوں ہوئی ہے کہ عرب اور اسلام کے رجال و شخصیات کے علاوہ اس میں مقامات و امکنہ کی تلمیحات بڑی تعداد میں موجود ہیں اور نعت کی مناسبت سے اس میں، ان رجال و اناث کی طرف بھی اشارے ہیں جن کا رسولِ مقبولؐ کی زندگی سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ بلکہ اس میں تاریخ العرب اور ایام العرب بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

کبھی اس نے دیکھا نہ تھا ایسا منظر	اُٹھا تو تو غورث کھڑا کانپتا ہے
شریکِ تجارت ترا قیس سائب	تجھے آشکارو نہاں دیکھتا ہے
نچھاور رہیں اُمِّ سُلَیم و مُلَیکہ	جگانے کو قُم قُم حبیبی کہا ہے
تجھے حکمِ بَلِّغ بِمَا اُنْزِلَ کا	مُعلّم بنا کر تو بھیجا گیا ہے
شتابان ہیں مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْق	دلِ مردِ مومن تو آہن رُبا ہے
تَہَادُوْا، تَحَابُّوْا، پیامِ اخوت	ترے دل میں بحرِ کرم بہہ رہا ہے

آنحضرتؐ کے اوصافِ حسنہ کے سلسلے میں خصوصیت سے عربی جملے (جو آیتیں، حدیثوں اور اقوالِ اسلاف

کا حصہ ہیں) بڑی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں عربیت کی پوری شان ہے ؎

کثیر المکارم کریم المساعی — نمائندۂ حضرتِ کبریا ہے
ضلیع الفم اشکل العین ابیض — نہ تابِ نظارہ نہ تابِ ثنا ہے
ہے ضرب المثل خافض الطرف اکحل — یہ اثمد کا سرمہ بھی کحل دجی ہے
کریم العصارہ، شریف الارومہ — تو فخرِ انام و حبیبِ خدا ہے

چند اور ترکیبیں دیکھئے:۔

ع کریم السجیہ، جمیل الطویہ

ع طلیق اللسان، فصیح البیان

اِن مثالوں سے خالد کے کلام میں بیکِ عرب کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے اور یہ نتیجہ نکالنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ عربیت کے اس عنصر نے نعت کے مضامین سے زیادہ اس خارجی فضا کو زندہ کیا ہے جو قدرتی طور سے رسولِ عربی کے ماحول کے قریب تھی۔ فارقلیط اور منحمنا دونوں میں یہ کیفیت موجود ہے۔ حضرت رسولِ کریم عرب کی پوری تاریخ کا مرکز و محور بن جاتے ہیں سب اگلے پچھلے واقعات شعاعوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کا منبع اور مظہر آفتابِ نبوّت ہے۔

خالد نے اس پر اکتفا نہیں کی۔ اُس نے اِس میدان کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ نعت کے قماش میں اساطیری ادب کے پیوند بھی لگا دیئے ہیں اور اس سے عظمت کا افق قریب سے بعید کے دائرے میں جا پہنچا ہے۔

مولٹن (MOULTON) نے بائبل کی ادبی قدر و قیمت کا یہ عنصر دریافت کیا ہے کہ اس میں رزمیہ کے عناصر موجود ہیں اور اس کے خصائص ادبی میں خاص طور سے یہ بتایا ہے کہ یہ عناصر ان تمام حصوں اور عبارتوں میں موجود ہیں جن میں اندازِ تبشیر اور پیش گوئیاں ہیں۔ اور رجال کا ذکر ہے۔ اور ان کے غیر معمولی (محیّر العقول)، اوصاف شجاعت و صداقت بیان ہوئے ہیں۔

بائبل اگرچہ بائبل ہے اور ہم بوجہ احتیاط تقدس اس کا کسی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام

سے موازنہ نہیں کرنا چاہیں گے۔ لیکن بائبل کے اثر و عکس کے حوالے سے بات کرنے میں شاید کوئی امر مانع نہ ہو۔

خالد کے اس نعتیہ کلام میں رزمیہ (EPIC) سپرٹ یا اس کا وہ انداز بطورِ خاص نمایاں ہے جو کسی صحیفے کا عکس لئے ہوئے ہے۔ خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر خود بھی ان اثرات کا، (خصوصاً عہد نامۂ قدیم و جدید کا) معترف ہے۔

اس اساطیری عنصر کی مزید توسیع کرتے ہوئے خالد نے یونانی اور ہندو دیومالائی تلمیحات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اور خاص یہ کہ ذرا سا خطرہ مول لے کر خالد نے اپنے شوقِ بے اختیار میں، نعت میں ہندو اصنامی زبان اور لہجہ بھی استعمال کر لیا ہے۔

یہ سب کچھ اُس نے تاثر کو گہرا کرنے کے لئے، یا رنگ کو زیادہ شوخ کرنے کے لئے کیا ہے۔ تاکہ نعت میں اسراریت (MYSTERY) عظمت اور تخیّلی رومانیت، ہیبت و حیرت اور جلال و جمال کے سب ذائقے جمع ہو جائیں۔

ELBIN LESKY نے اپنی تازہ ترین کتاب A HISTORY OF GREEK LETERATURE میں یونانی اصنامی ادب کے بارے میں بلاغت (RHETORIC) کے غلبے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں رزمیہ نگار اور ڈرامہ نگار اور شاعر یہ چاہتے تھے کہ قدرت کے تمام اوصاف ان کے ہیرو میں جمع ہو جائیں تاکہ قوم بھی اس قسم کے سب اوصاف کو اپنے اندر جمع کرنے کے لئے انہیں اپنا نمونہ بنا سکے۔ خالد کے یہاں بھی یہ غرض و غایت نظر آتی ہے۔

اب وہی خارا تراشی اور سنگلاخ آفرینی، سو یہ خالد کی نعت تک محدود نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نعت میں خصوصاً ضمناً میں کرختی و درشتی اور "گراں سنگی" کے تاثر سے زیادہ ادب کی سنجیدگی اور محبت کی مٹھاس ہے جو نسبتاً ملائم لفظوں کی غنائی کیفیتوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابن العربی کی "ترجمان الاشواق" اردو میں لکھی جا رہی ہے۔ ابن العربی کے یہ اشعار دیکھئے :-

خَلِیلَیّ عُوجابالکَثِیبِ وعَرِّجَا — علی نَغلَعِ، واطلُبْ مِیاہَ یَلَمْلَمِ

فَإنّ بہامَنْ قَدْ عَلِمْتَ وَمَنْ لَہُمْ — صِیامی وحَجّی واعتمادی وموسمی

فلا أنسَ یوماً بالمحصّبِ مِن مِنًی — وبالمَنحَرِ الأعلیٰ أمورًا وزمزمِ

وَنادِ القِبابَ الحُمرَمِن جانبِ الحِمی — تحیّۃَ مُشتاقٍ إلیکُمْ مُتیّمِ

وَنَادِ بدَعْدٍ والرّبابِ وزَینبٍ — وھندٍ وسَلمی ثمّ لُبنی وزمزمِ

ترجمان الاشواق کے حوالے سے اب خالدؔ کے یہ اشعار دیکھئے ؎

حمود و حامد و احمد، محمّد و محمود — کریم و میر کرام و مکرّم و اکرم

درود بر نبیِ آخر الزماں کہ جو ہے — سلیم و صاحب اسلام و سالم و اسلم

فضیل و فاضل و افضل، مفضّل و مفضال — جمال و خیر کا منبع و معدن و منجم

بساطِ حیّزِ امکاں ہے فرشِ پا انداز — شفق شمائل و گل طلعت و بہار شیم

اِن اشعار میں خارا تراشی کا فن ملا مُتوں کا جو یا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں آنحضرتؐ کی عظمت کا قصرِ مقرنس تعمیر کیا جا رہا ہے۔ وہاں آپؐ کے خلق کریم کا خوشگوار اور سکون بخش تاثر بھی دینا مقصود ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو شاعر کی نہ بجھنے والی پیاس، یا شوق محبت و عقیدت بھی ہے جو ایک لفظ پر قانع نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک لفظ کے صدہا اشتقاقات مہیا کرتا ہے۔ اور اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ شاعر کے جذبے رسولِ پاک کے بارے میں لا انتہا ہیں اور وسعت طلب ہیں۔

اور پھر شاعر کو اپنی ایجاد کا ڈر بھی ہے، اس نے "احیائے مصطفویہ" کی خاطر، عظمت و فخامت کے جن تخیلی نقوشِ احساس کو اُبھارنا اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہے۔ یہی تقاضا اسے عظمتوں کے عظیم سے عظیم اور فخیم سے فخیم تصوّرات کی باز آفرینی پر بھی مجبور کر رہا ہے۔ وہ اذہان کو عظمت کے نقش و اشہ سے بھر دینا چاہتا ہے جو کبھی تھی اور اب نہیں۔ اور اس کے لیے وہ مروّجہ "سُست نظم" اسلوب کو ترک کر کے اپنے اجتہاد سے ایک "جہیر الصوت" طرزِ بیان اختراع کرتا ہے تاکہ قلوب اور اذہان عمومیت اور ارزلیت اور زبونیٔ ہمت کے بجائے اقدارِ عالیہ اور حکمتِ متعالیہ سے مانوس ہو سکیں، بلاشبہ

یہ سنگلاخ آفرینی ہے لیکن ظاہر ہے کہ جن ادوار میں لوگ افکار و معانی کے بارے میں بے حس ہو جاتے ہیں اور بعض مادیات و محسوسات سے دل لگا لیتے ہیں۔ ان میں ایسے شاعر ضرور آتے ہیں جو معقولات کے بجائے محسوسات کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ صرف حس کی تسکین کرتے ہیں۔ ابلاغی معانی سے واسطہ کم رکھتے ہیں۔ خالد بھی ان معنوں میں حسّ کا شاعر ہے۔ گراں سنگ الفاظ کا شاعر، جو سہل انگاری سے اُکتا گیا ہے۔ محاورۂ عام سے اس کا جی بھر گیا ہے۔ وہ نادر محاورہ اختیار کر کے نُدرت اور جدّت کا نیا راستہ کھولتا ہے۔ خاقانی نے یہی کیا تھا۔ بیدل اور غالب نے یہی کیا۔ اور ایک حد تک اقبال نے بھی یہی کیا۔ اگرچہ اس موقع پر خالد کا ان سے موازنہ کرنا مقصود نہیں۔ بہر حال عظمت کی جستجو خالد کا محبوب نصب العین ہے۔ مگر نعت تو با ادب با ملاحظہ ہوشیار کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس لئے اس کی نعتوں میں اس کے اصلی رنگ کا ملائم ترین اور خوشگوار ترین رنگ نکھر آیا ہے۔ کیونکہ خطاب حضرت رسولِ پاکؐ سے ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں بلند آواز سے بات کرنے میں بھی بے ادبی کا احتمال ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

خالد کی روشِ فکر و سخن

عبدالعزیز خالد نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ ؎

شریکِ بزمِ زُہیر و ہمام بن غالب[1]
ندیمِ غالب و اقبال و شمس تبریزم

ان کا یہ دعوٰے بے بنیاد نہیں ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے اُن کے کلام کے دو چار مجموعے بھی گزرے ہیں وہ اِس بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کے یہاں فکرِ اسلامی کو ہر جگہ مشعلِ راہ بنائے رکھنے کی کوشش اور فنی اظہار و ابلاغ میں مروّجہ اسالیب سے بچ کر چلنے کی روِش دو ایسی چیزیں ہیں جو فی الواقع ان کے کلام کے مطالعہ کے وقت قاری کو غالب اور اقبال کی یاد دلاتی ہیں غالب کا ذکر آگیا ہے تو ان کے متعلق مولانا حالی کی چند سطریں دیکھتے چلئے۔ "یادگارِ غالب" میں شاعری پر بحث کرتے ہوئے ایک بڑی پتے کی بات کہہ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"مرزا کی ابتدائی شاعری کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اوریجنلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں، ان کی بلند فطرتی، اور

---

[1] منحمنا کے نئے ایڈیشن میں یہ مضمون یوں آیا ہے ؎

حریفِ پُشکن و سوفوکلز و کالیداس | ندیمِ غالب و اقبال و شمس تبریزم
شریکِ بزمِ فسوں رنگ حافظ و خیام | زُہیر و نابغہ و ذوالقروح کا ہمدم

ان کی غیر معمولی قابلیت واستعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد
کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر
آنکھ بند کر کے گلّے کے پیچھے پیچھے ہولیں اور لپک کے اِدھر اُدھر نظر اُٹھا کر نہ
دیکھیں۔ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِ مُو تجاوز نہ
کریں۔ اور اُن کے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں۔ برخلاف اس کے جن کی
طبیعت میں اوریجنلٹی (ORIGINALITY) اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے
میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ وہ
جس عام روش پر اپنے ہم فنون کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس پر چلنے سے ان کی طبیعت
ابا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں۔ وہ منزلِ مقصود تک
پہنچانے والا نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کے طبیعت کی
جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چُور نہ ہو جائیں۔ عام راہ گیروں کی طرح آنکھ بند
کر کے شارع پر پڑ جائیں۔"

عبد العزیز خالد کی روشِ سخن گوئی پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ان کے ہاں بھی اسلوب و مواد
دونوں میں ابداع و اختراع کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ملتی ہیں۔ اِن چالوں کے سبب وہ اردو شاعری
کی مروجہ ڈگر اور لب و لہجہ سے بہت الگ ہو گئے ہیں۔ اتنا الگ کہ بعض کے نزدیک وہ اجنبی ہیں
بعض کے نزدیک محض لفّاظ۔ بعض کی نظر میں مشکل پسند اور بعض کے لئے مہمل گو۔ یہ الگ بات
ہے کہ عبد العزیز خالد نے اپنے قارئین اور ناقدین کو غالب کی طرح اِس قسم کے طنز کا نشانہ نہیں بنایا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ۔۔۔ ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کر جاہل[1]
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔۔۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

---

[1] یہ مصرع پہلے یوں ہی تھا بعد میں اسے غالب نے اِس طرح کر دیا تھا ع
"سن سُن کے اسے سخنوران کامل"

لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ غالبؔ کی طرح عبدالعزیز خالدؔ نے بھی اپنے قارئین و ناقدین کی آرا کا اثر قبول کیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے ابتدائی اور بعد کے کلام میں خاصی تبدیلی نظر آتی ہے۔ اور پہلے کے مقابلے میں تازہ تر کلام میں ایک خوشگوار و دل نشین لب و لہجہ کا احساس ہوتا ہے یہ بات میں ان کی دو تازہ تر تصنیفات "منحمنا" اور "لحن صریر" کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ اس وقت صرف یہی دو میری دسترس میں ہیں اور انہیں کی روشنی میں ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

"منحمنا" جیسا کہ خود عبدالعزیز خالدؔ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ؎

"ہے یہ من جملۂ اسمائے رسولِ مقبولؐ"

یعنی اس کتاب کا موضوع آنحضرتؐ کی شخصیّت ہے جسے آپ اصطلاحِ شاعری میں نعتیہ قصیدہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ قصیدوں میں بھی فنی نقطۂ نظر سے اسے قصیدۂ میمیہ کا نام دیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ "میم" کی ردیف میں کہا گیا ہے۔ ذرا اس "میم" کو ذہن میں رکھ کر اس کے موضوع "منحمنّا" یا "محمّدؐ" پر غور کیجئے۔ اور کتاب پر ایک نظر ڈالیئے۔ صاف اندازہ ہوگا کہ موضوع یا مواد کو فنّی صورت دینے میں شاعر نے کسی مصنوعی یا شعوری کوشش سے کام نہیں لیا بلکہ موضوع بالکل فطری انداز سے مناسب ترین ہیئت میں خود بخود ڈھل گیا ہے۔

"منحمنّا" کا موضوع حد درجہ عظیم بھی ہے اور حد درجہ نازک بھی۔ عظیم اس لئے کہ اگر آپ اور ہم اس کے اوصاف کے باب میں خاموش رہیں تو بھی اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور اگر اپنی سمجھ میں سب کچھ کہہ دیں تو کہنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ نازک اس لئے کہ اس کی سرحدیں حمد و منقبت کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہیں۔ اور کسی شاعر کا اس طرح بچ بچ کر چلنا کہ اس کا کوئی قدم اپنی حدود سے تجاوز کر کے دوسری سرحدوں میں نہ پڑنے پائے، بہت مشکل ہے۔ نعت گوئی کی یہی نزاکتیں اور دقّتیں تو ہیں جن کے سبب اردو میں اعلیٰ درجہ کے نعتیہ شاعری کا سرمایہ نہ ہوتے کے برابر ہے کہنے کو تو رسماً اس طرف اکثر شعرا نے توجہ کی ہے۔ بلکہ شاید ہی اردو کا کوئی ایسا شاعر ہو جس نے

بارگاہِ صمدیت اور بارگاہِ رسالت میں سجدۂ شکرانہ کے طور پر اشعار نہ پیش کیے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اشعار دوسری دنیا میں اس کی سرخروئی کا سبب بھی بن گئے ہوں۔ لیکن جہاں تک دُنیائے شعر وسخن کا تعلق ہے اس میں چند ایک کے سوا کسی کو قبولِ عام کیا، قبولِ خاص بھی میسر نہیں آتا۔ ان میں آپ کو ناسخ لکھنوی اور سیماب اکبر آبادی جیسے شعرا بھی مل جائیں گے۔ جنھوں نے احادیثِ نبوی اور قرآن کریم کو نظم کا جامہ پہنا کر ثوابِ دارین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور درد و اصغر جیسے صوفی باصفا بھی مل جائیں گے جن کی زندگی کے اکثر لمحات وظائف و اوراد میں بسر ہوئے۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ امیرِ مینائی اور محسن کاکوروی کے ایک دو قصیدوں، ایک دو مثنویوں، مولانا حالی کے مشہور مسدس کے بعض ٹکڑوں اور علّامہ اقبال کے بعض اشعار و قطعات کے سوا کسی کا نعتیہ کلام صاحبانِ نقد و نظر کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ ایسی صورت میں عبدالعزیز خالد کا ایک مشکل ترین صنفِ سخن کی طرف توجہ کرنا اور مسدسِ حالی کے طرز پر وقت کے تقاضوں کے مطابق ثنا و مناجات اور نوحۂ قومی پر مشتمل نعتیہ نظم دے کر اس میدان میں اپنے لئے ایک ممتاز و نمایاں جگہ بنا لینا ان کی غیر معمولی شاعرانہ فطانت کا ثبوت ہے۔

عبدالعزیز خالد کا نعتیہ شاعری کی طرف توجہ دینا ایک اور سبب سے نہایت اہم خیال کیے جانے کے لائق ہے۔ آج کے لادینی عہد میں جبکہ مسلم معاشرہ، سستی شہرت اور دولت کے جائز و ناجائز حصول کو سب کچھ سمجھتا ہے، اور دین کی صالح اقدار و روایات کو اپنی کج فہمی سے حصۂ ماضی خیال کرتا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ایسے صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ فکر حضرات ان اقدار و روایات کی اشاعت و حفاظت کا ذمہ لیں جو اپنی خلّاقانہ صلاحیتوں اور فنکارانہ سحر کاریوں کے ذریعے معاشرے کو بہ آسانی اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے ماحول میں جس میں اکثر حضرات بزعمِ خود اسلامی قدروں یا مذہبی موضوعات کو ادب و شعر کا موضوع بنانا رجعت پسندی خیال کرتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد نے اس طرف خصوصی توجّہ کی اور ایک بالغ نظر مفکّر و شاعر کی حیثیت سے اس راز کو بہت جلد پا گئے کہ شاعر کے لئے اس دُنیا میں بذاتِ خود

نہ کوئی موضوع فرسودہ ہے نہ تازہ، بلکہ یہ شاعر کی ذات ہے جو فن کے جادو کے ذریعے فرسودہ کو تازہ اور تازہ کو فرسودہ بنا دیتی ہے۔

"قصیدہ" جیسا کہ ان کے فن کا تقاضہ ہے۔ شاعر سے موضوع یا ممدوح کے باب میں پُرجوش عقیدت اور زبان و بیان کے باب میں غیر معمولی قادر الکلامی کا مطالبہ کرتا ہے۔ "منحمنا" میں یہ دونوں باتیں نظر آتی ہیں۔ شاعر کو موضوع سے گہرا لگاؤ ہے۔ یعنی اس نے جو کچھ کہا ہے رسماً نہیں کہا، بلکہ جذبِ اندروں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا ہے۔ اس مجبوری نے پورے قصیدے کو جذباتی صداقت سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ قلم، کرم اور دم کی زمین میں تقریباً ۰۰ ۵ اشعار کا قصیدہ کہنا ہی شاعر کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ قصیدے کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک مصرعہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ شاعر کا مطالعہ وسیع اور اردو فارسی کے ساتھ عربی زبان پر بھی اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ عربی کے بعض الفاظ و فقرے تو اس خوبی کے ساتھ اشعار میں در آئے ہیں۔ گویا وہ ایک مدت سے اردو میں مستعمل ہیں اور ہماری زبان کا فطری جزو ہیں۔ چند شعروں میں ان کا مصرف دیکھئے ؎

اگر بقا کا ہے ارماں تعاہدُ والقرآں | کہ ہے یہ سیلِ فنا میں حصارِ مستحکم

--- ٭ ---

لبوں پہ ہے یہی تسبیح لا تُزِغْ قلبیْ | ہے دشتِ شوق میں ہر گام جاں کا جوکھم

--- ٭ ---

جہاں مظاہر و آثار پر لگاتا ہے حکم | دلوں کے حال سے ہے عَزّ اِسمُہٗ اَعلَم

--- ٭ ---

زبان نشر گہِ لَا اِلٰہَ غَیرُ اللہ! | بدن ہوس کا نگارینۂ بُت قدِ آدم

--- ٭ ---

زبانِ وحی میں جس کو پکاریں "مُزّمّل" | قیامِ شب سے لہے جس کے ساق و بابیں ورم ۔

لیکن عبدالعزیز خالد کا فن اقبال کے انداز میں عربی کے بعض ٹکڑوں کو اردو میں نگینہ کی طرح جڑنے تک محدود نہیں ہے۔ انہوں نے نظم میں موضوع کی رعایت اور قافیے کی بعض مجبوریوں سے یقیناً عربی الفاظ سے زیادہ کام لیا ہے۔ لیکن ٹھیٹھ اردو کے قرانی سے بھی وہ بے نیاز نہیں رہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جہاں انہوں نے اس قصیدے کی معرفت اردو کو عربی کے بہت سے نئے الفاظ دیئے ہیں وہاں محسن کاکوروی کی طرح انہوں نے ہندی اور سنسکرت کے بعض الفاظ بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں۔ صرف چند مثالیں دیکھئے ؎

براجماں ہوئے آکاش پر مکٹ دھاری　　　سُبَج سُہاس سے چھلکائے پریم رس پیتم

—— ❖ ——

یہ سُرب بھومی کا راجہ، مہابلی، سمراٹ　　　اَپار، اَتھاہ، اَننت، ایک، نیک، وِشوتم

—— ❖ ——

ہے اُپسراؤں کے کومل لبوں پہ کھیم کُسَل　　　بنا دیا ہے مُسرّت نے سانس کو سرگم

—— ❖ ——

حنائی اُنگلیوں کی ضربِ دلنشیں دَف پر　　　پڑے پھوار سی پھولوں پہ جس طرح جُھم جُھم

—— ❖ ——

کنوار چھل کی مہک، مور چھل جھلاتی ہے　　　ٹھسک سے چلتے ہوئے چھم چھماتے ہیں پری جُھم

—— ❖ ——

مُکُٹ رچے سوشیل، سہج رسیل سبھاؤ　　　رہیں بہار پہ جُگ جُگ جوانیاں جم جم

—— ❖ ——

وہ شاہزادہ کہ یاولی کے ہوں احکام　　　کہ ارتھ شاستر چانکیہ مُنی کے نیَم

—— ❖ ——

ہیں دونوں ہم قدح و ہم نورد و ہم سوگند　　　ہے ان میں قدرتی سمبندھ، مَن لگن، اُنگم

کھنچا ہے قشقہ، لگا ہے تلک، بنا نام م　　ہیں وضع وقطع سے جوگی، نیوگی اندر سے

---- ٭ ----
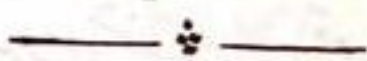
غرضیکہ عبدالعزیز خالدؔ نے منحمنّا کے ذریعے ایک طرف اردو شاعری کو از سر نو ایک عظیم موضوع سے آشنا کیا ہے۔ دوسری طرف نئی نئی تلمیحات اور نئے عربی و ہندی الفاظ سے انہوں نے اردو زبان کے دامن کو وسعت دی ہے۔

عبدالعزیز خالدؔ کی دوسری تازہ ترین تصنیف "لحن صریر" میرے سامنے ہے۔ یہ رباعیات کا مجموعہ ہے۔ رباعی کو اردو، فارسی کی مختصر نظم کہنا چاہیئے۔ اس لیے کہ اس میں صرف چار مصرعوں میں پوری بات کہنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پابندی کے ساتھ موثر و دلکش پیرائے میں کچھ کہنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جب غزل کے دو مصرعوں میں مکمل مضمون ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا اختصار کسی شاعر کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تو چار مصرعے شعر گوئی میں کیونکر سدِّ راہ بن سکتے ہیں۔ یہ اعتراض درست ہے۔ لیکن رباعی کے ساتھ کچھ اور پابندیاں بھی ہیں، جو اُسے غزل گوئی سے بھی زیادہ مشکل بنا دیتی ہیں۔ رباعی کے لیئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے چار مصرعے یا کم از کم تین مصرعے باہم مُقفّیٰ ہوں۔ اس سے زیادہ یہ کہ دوسرے اصناف کی طرح رباعی ہر ایک بحر اور ہر ایک زمین میں نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی بحر اور اس کا وزن مخصوص ہے۔ یہ وزن قدیم ایرانی ترانے کے اوزان سے ماخوذ ہے اور قدیم ایرانی ترانے کی اساس موسیقی کے راگوں اور آواز کے لحنوں پر قائم ہے۔ اس لیے جب تک کوئی شاعر قادر الکلام ہونے کے ساتھ ساتھ لحن و بحر کا گہرا شعور نہ رکھتا ہو، رباعی کا فن قابو میں نہیں آتا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عبدالعزیز خالدؔ میں یہ اوصاف موجود ہیں۔ وہ ایک خلّاق شاعر ہونے کے ساتھ موسیقی کے لحنوں کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ متعدّد زبانوں کے نبض شناس بھی ہیں اور ان زبانوں کی روایات و تلمیحات کے ذریعے اپنے کلام میں رنگ بھرنے کا ہُنر بھی جانتے ہیں۔

لیکن "لحن صریر" کی اہمیّت صرف زبان و بیان کے محاسن کے سبب نہیں ہے اس کے اور اسباب

بھی ہیں ۔ یہ عبدالعزیز خالدؔ کی دُوسری تصانیف کے مقابلے میں یوں اہم تر ہو جاتی ہے کہ یہ ان کے جملہ افکار و خیالات اور ان کی سیرت و شخصیت کا مرقع ہے ۔ اس میں چھ سو سے زائد رباعیاں ہیں ۔ اور چونکہ ہر رباعی کسی موضوع یا خیال کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے ایک مختصر و مکمل نظم کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ ان کے سارے خیالات بشکلِ رباعیات " لحنِ صریر" میں سمٹ آئے ہیں ۔ چنانچہ اگر آپ کو یہ معلوم کرنا ہو کہ عبدالعزیز خالدؔ زندگی اور فن کے مسائل پر کس طرح غور کرتے ہیں اُنھیں کس انداز سے دیکھتے ہیں ۔ وقت کے تقاضوں سے کس حد تک اور کس نہج سے متاثر ہوئے ہیں ۔ سیاست ، تہذیب ، مذہب ، اخلاقیات اور انسانیت کو پرکھنے کے لئے ان کے پاس کیا معیار ہیں ۔ ان معیاروں کے پیچھے کونسا نقطۂ نظر کام کر رہا ہے ۔ یہ نقطۂ نظر ان کا اپنا ہے ، یا دُوسروں سے مستعار ہے ۔ اس نقطۂ نظر کو انہوں نے اپنے فن میں کس طرح برتا ہے ۔ اس طرح اور بہت سے سوالات جو کسی شاعر کی زندگی اور مطالعے کے وقت قاری کے ذہن میں اُبھرتے ہیں ان سب کے جوابات لحنِ صریر میں ملتے ہیں ۔ گویا خالدؔ اور ان کے کلام کو سمجھنے سمجھانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ انتخابی نہیں رہتا بلکہ لازمی ہو جاتا ہے ۔ ذیل کی چند رُباعیاں دیکھیئے یہ مختلف خیالات کی حامل ہیں ۔ لیکن سب مل کر اکائی بناتی ہیں اور اس اکائی کا دُوسرا نام عبدالعزیز خالدؔ ہے ۔

حقیقی شاعر

شاعر طبعاً دروں نگر ہوتا ہے ۔۔۔ از سرتا پا قلب و نظر ہوتا ہے
رہتا ہے وہ اپنے آپ میں گُم لیکن ۔۔۔ اخبارِ جہاں سے باخبر ہوتا ہے

—— ٭ ——

زہراب کو انگبیں بنا لیتا ہے ۔۔۔ الحاد کو جزوِ دیں بنا لیتا ہے
ہے اَنفُس و آفاق میں جو شے بھی اُسے ۔۔۔ شاعر ملکِ یمیں بنا لیتا ہے

—— ٭ ——

رموزِ حیات

اَلمُلکُ فِی صِغَارِکُم، بدمستی	اَلعِلمُ فِی رُزَالتِکُم۔ پستی
اَلحِرصُ عَلَی المَالِ تنابے محال	اَلحِرصُ عَلَی العُمرِ فریبِ ہستی

ہوسِ دُنیا

اِبداعِ معانی ہے نہ حُسنِ اسلوب	کرلی ہوسِ زر نے فطانت مسلوب
آزادیٔ افکار کا خورشید ہُوا	مغرب سے طلوع ہو کے مشرق میں غرُوب

٭

ہے علم کی دولت سے تجارت مطلوب	لکھتے ہیں کتاب کی بجائے مکتوب
قرآن کو بیچتے ہیں اہلِ قرآں	کرتے ہیں مسیحا کو مسیحی مصلوب

بوالعجبی

دیں اہلِ وطن کو درسِ حبُّ الوطنی	در پردہ وطن کی جو کریں بیخ کنی
اِخوانِ صفا کے محتسب اہلِ ریا	یہ پستی، یہ بلندی، اللہ غنی!

آمریّت

ماموُرِ مِنَ اللہ بنے ہر آمر	اِدراکِ مقاماتِ بشر سے قاصر
افکار و خیالات کا گھونٹے وہ گلا	سچ کا کرے قتلِ عام مثلِ نادر

اِن رباعیوں کے عنوانات میں نے وسعتِ مضامین کے اظہار کے لئے خود قائم کئے۔ آپ چاہیں تو اسی انداز سے "لحنِ صریر" کی ہر رباعی کو عنوان دے کر خالد کے فکر و فن کے خطوط کو بہ آسانی پڑھ

سکتے ہیں۔

اوپر میں نے خالد کے جن دو تخلیقی مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اتفاق سے ہماری شاعری کی قدیم ترین اصناف یعنی قصیدہ اور رباعی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن معنوی اعتبار سے دونوں مجموعے اپنے عہد کے تازہ میلانات اور وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ گویا پیمانے پُرانے ہیں، شراب نئی ہے اور اس کا نشہ کم و بیش زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔

عفت موہانی

عاشقِ رسولؐ خالدؔ

عبدالعزیز خالدؔ کی شاعری مختلف قسم کے فکر و فن کا ایک ایسا سنگم ہے جس کا اصلی سرچشمہ اگر صحیح معنوں میں کوئی ہے تو اسلام اور بانئ اسلام کی تعلیمات ہیں۔ یہ والہانہ جذبہ اور مخلصانہ سرشاری ورثہ ہے علامہ اقبالؔ کا جو بالراست خالدؔ کی مذہبی شاعری میں منتقل ہوا۔ علامہ اقبالؔ نے نعتیہ شاعری کا جو ذخیرہ ہمارے ادب میں چھوڑا ہے اس کے متولی اور وارث آجکل خالدؔ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اقبالؔ نے مذہبی اور اسلامی شاعری کا اگر ننھا سا پودا لگایا تھا تو اس کی آبیاری اپنے فکر و فن کے خون سے خالدؔ نے کی اور آج یہ درخت اتنا تناور بن گیا ہے کہ اس کی جس شاخ کو دیکھئے مختلف اصناف کے شگوفے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کا ذہنی مشاہدہ بہت بسیط تھا۔ خالدؔ نے اس مشاہدہ کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے اور یہ کہنے میں یقیناً کوئی مبالغہ نہیں کہ خالدؔ نے اپنے مورثِ اعلیٰ کی چھوڑی ہوئی ذہنی دولت سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ اور صحیح معنوں میں اس دولت کی افزونی کا باعث بنے۔ ہر ملک و قوم اور ہر زبان نے اپنے اپنے مفکرین چھوڑے ہیں۔ اردو زبان کی بے انتہا خوش نصیبی ہے کہ اسے خالدؔ جیسا قادر الکلام، رفیع النظر، وسیع الخیال اور بے ہمتا شاعر نصیب ہوا۔ یقیناً مذہبی اور اسلامی شاعری کا چرچا کم ہو جاتا اگر خالدؔ اسے فروغ نہ دیتے اور آگے نہ بڑھاتے بلکہ اپنے متاخرین اور معاصرین کے لئے ایک نیا دراستہ نہ کھول دیتے۔ جہاں ان کے معنوی معلم مولانائے رومؔ اور علّامہ اقبالؔ ہیں۔ وہیں انہوں نے دُنیا کے ہر بڑے عالم و شاعر اور دُنیا کی ہر بڑی زبان کی بہترین کلاسیکس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اور اس طرح اردو زبان کے ذخیرۂ علم و ادب میں بیش بہا ادبی و شعری سرمائے کا اضافہ کیا۔

اس عظیم و رفیع الشان شاعر کو جہاں دُنیا کے بہترین اور اعلیٰ ترین فن کاروں نے متاثر کیا ہے

وہاں اس کا اپنا ذہنی مبلغِ علم بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ قادر الکلام شاعر دُنیا کی مشہور زبانوں پر کامل عبور رکھتا ہے۔ عربی، فارسی، عبرانی، انگریزی اور یونانی زبانوں میں جو کچھ جواہرات علمی وادبی اس قابل نظر آئے کہ وہ اہلِ علم کی نظروں کے سامنے پیش کئے جائیں وہ انہوں نے تراش خراش کر اور اپنی جودتِ طبع سے نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر نکھار سنوار کر پیش کئے کہ ان جواہر پاروں نے دُنیا کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔

مثلاً خالد کا ایک نہایت عظیم کارنامہ "فارقلیط" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ خالد کے بلیغ فکر و فن کا ایسا ارفع مرقع ہے کہ بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل ایسی جامع و مانع نہ کوئی کتاب تھی اور نہ اس کے بعد مستقبل قریب و بعید میں مرتب کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسا حرفِ آخر جس کے بعد شاید خود شاعر نے اپنا عجوبہ روزگار قلم توڑ دیا ہوتا، اگر معاً بعد "منحمنا" لکھا نہ ہوتی فارقلیط کی "تلاوت" سے پتہ چلتا ہے کہ سرتاسر شاعر کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مقدس میں ڈوب کر رہ گئی ہے۔ وہ چلتے ہیں اسی جادہ پر جو سرکارؐ نے بتایا ہے۔ سوچتے ہیں وہ سب کچھ جو پیغمبرِ اسلام نے سوچنے اور عمل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ رکھتے ہیں وہی سب کچھ جو اسوۂ حسنہ پر مبنی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے خالد کی بے پناہ محبت نے بے پایاں خلوص و عقیدت دوسروں کے لئے باعثِ رشک ہے۔ مگر یہ تو وہ دولت ہے جسے خدائے بخشندہ بخش دے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض سرورِ کائنات ہی سے محبت اور عقیدت کا فیض ہے کہ شاعرِ اعظم نے بہت جلد اپنی صحیح منزل کا سراغ پا لیا۔ قرآن و حدیث کے بسیط مطالعہ کو خالد نے اپنے ایک ایک شعر میں سمویا ہے۔ اور عربی آیات بلا تکلف مصرعوں میں استعمال کی ہیں ؎

توحید ہے مرکزِ رخِ فکر و نظر	توحید ہے ایمان کا مدار و محور
لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ	اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ

عربی، فارسی، اردو یا ہندی زبانوں کے بے شمار الفاظ وہ اپنے شعر میں یوں استعمال کرتے ہیں جیسے مرصع ہار، کوئی لفظ بے محل بے موقع نہیں معلوم ہوتا۔ خالد کا منشا و مقصد بانیٔ اسلامؐ کے فرمودات

کو حتی الامکان دُور دُور تک پہنچاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جو کچھ ہے یا جو کچھ تھا اور جو کچھ رہے گا، وہ فقط اللہ کی ذات ہے ؎

جو چیز ہے انسانی، فانی ہے مگر
ما عند اللہ باقِ اے ابنِ بشر!
مہمان و مسافر کی طرح صاحب سیر
کرتا ہے اس آباد خرابے میں بسر

ذاتِ محمدیؐ سے شیفتگی دیکھئے کہ کس طرح شمعِ رسالت کے پروانے بن جاتے ہیں

مطاعِ آدم و انجم متاعِ لوح و قلم
محمدؐ اُمّی محبوبِ کبریا صلعم
محمدؐ انجمن کُن فکاں کا صدر نشیں
محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم

صرف یہی نہیں بلکہ منحمناً ایک مترنّم، مقدس اور دلنشیں لے ہے۔ جس کا سُر ایک، سرگم ایک اور آہنگ شروع سے لے کر آخر تک ایک جیسا ہے۔ فارقلیطؒ اور منحمنا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد کے اجسامِ شعر میں محبتِ نبویؐ و عشقِ الوہی گرم گرم جیتا جیتا خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ جسے نہ زوال ہے نہ اضمحلال اور نہ موت! یہ عشق لافانی اور یہ محبت ابدی ہے، باایں علم و فضل، سرفرازی و ناموری کے خالد جگہ جگہ اپنی کم مائیگی کا اظہار یوں کرتے ہیں، کہ یہ کمتری دوسروں کے نزدیک برتری بن جاتی ہے جس کے وہ سزاوار ہیں ؎

ہے بانوائی کے باوصف بے نوا خالد
فغاں کہ تشنہ دہاں ہے بجیرۂ بحرم

نہ صرف یہ کہ وہ ارشاداتِ نبویؐ کو پھیلانے بڑھانے کا ادعا کرتے ہیں، ہر طرح اور ہر طریقے سے ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اسی ازلی راستے پر اپنے معاصرین و متاخرین کو لے کر چلیں جو رہبرِ اسلام نے وضع کیا ہے۔ اس کے لئے وہ قرآنی آیات کا سہارا لیتے ہیں۔ احادیث سے مطالب [illegible]

ہیں۔ لیکن جب خاطرؔ خواہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے تو بے اختیار زبانِ قلم سے نکل جاتا ہے ؎

خالدؔ لبِ گویا ہے نہ گوشِ شنوا
بے نور ہوئی روشنئ شہرِ نوا
انبوہِ خلائق میں ہے گم سُم شاعر
دل خستہ جگر سوختہ تنہا تنہا

اسلامی فلسفہ خالدؔ کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ وہ بتاتے ہیں ؎

اللہُ احد جس کی اساسِ محکم
ہے رتبہ شناس صاحبِ خیرِ اُمم
اس قُبّۃ الاسلام پہ لہراتا ہے
لانسرفُ غیر العربی کا پرچم
وہی ہو مقصد و مقصودِ آفرینش ہے
بنا ہے جس کے لئے یہ مرقعِ عالم

اس کے علاوہ خالدؔ کا پیغام ہے کہ وہ روشنی جو کفر و ضلالت، شرک و بدعت کی تاریک ترین گھاٹیوں سے نکال کر اُمتِ مُسلمہ کو صحیح جادۂ حیات پر گامزن کر سکتی ہے، اسلام کی ہے۔ خدا اور رسُول کی ہیبت و محبت سے خالدؔ کا دل لبریز ہے۔ اور یہ نعمتِ بے بہا وہ ہر مسلمان کو سونپنا چاہتے ہیں۔ ان کا اضطراب درد اور کرب ان کے ایک ایک لفظ اور سطر سے چھلکا پڑتا ہے۔ اپنے محبوب کی مدح و ستائش میں وہ گُم ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے نمود و نمائش، دُنیوی جاہ و جلال، شہرت و توصیف سے دامن بچایا اور ہمہ تن سرکارِ دو عالمؐ کی مدحت میں غرق ہو گئے۔ ان کے فکر و فن کا دھارا اس مقام پر آ کر اس زور شور سے اپنا بہاؤ دکھاتا ہے کہ اس کے آگے دوسری تمام اصنافِ شاعری کالعدم ہو جاتی ہیں۔ اگر خالدؔ صرف "فارقلیط" اور "منحمنّا" لکھتے تب بھی انہیں اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ان کا عشق انہیں اس

مقام تک لے گیا ہے جہاں وہ بے اختیار انا الحق پکار اُٹھتے ہیں۔ عشقِ رسولؐ کی منزل انہیں اپنے ہمعصروں سے کئی گنا بلندی پر لے گئی۔ آج وہ اس مقام پر ہیں جہاں تک پہنچنے کے لئے دُوسرں کے تخیلات کے پَر جلنے لگتے ہیں۔ گو کہ ان کے معاصرین بھی روایتی شاعری میں شانہ بشانہ چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ مقام ہی ایسا ہے جہاں ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اَور

کوئی بڑے سے بڑا شاعر اسلامی شاعری میں خالدؔ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ وہ قُل ہُوَ اللہ ہے جس کا ہزاروں سبع المعلقہ مل کر بھی جواب تیار نہیں کر سکتے۔ ایک فلسفی، دانشور، مفکّر اور عالم کی حیثیت سے خالدؔ کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور نہ خاطر خواہ تعریف کی جا سکتی ہے۔ خالدؔ کے معاصرین روایتی شاعری کے پیچ و خم میں بھٹکتے رہ گئے۔ اور خالدؔ فارقلیط، منحمنّا، لحنِ صریر، سرِ دلبرانہ، دُکانِ شیشہ گر، سلومی، برگِ خزاں، گلِ نغمہ، کفِ دریا، اور دشتِ شام وغیرہ میں نہ جانے کہاں سے کہاں، کیا کچھ اپنے ساتھ لیتے ہوئے نکل گئے۔ اِس صدی کی پوری تاریخ صرف ایک خالدؔ پیدا کر سکی ہے ممکن ہے کہ آگے چل کر اور بھی کوئی اس صنف میں اپنا نام پیدا کرے۔ لیکن "فارقلیط" اور "منحمنّا" کے ساتھ ساتھ اور دُوسرے رفیع المرتبت شعری کارنامے ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔ ان کا نام، ان کا کلام اسلامی تاریخ میں ہمیشہ عزّت و احترام اور توقیر و شان سے لیا جائے گا۔

خالدؔ کے کلام کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ قبل از قبل ان کے تدریجی ذہنی ارتقار کا مطالعہ کیا جائے۔ گو کہ یہ ناممکن ہے۔ خالدؔ علم کا وہ بحرِ بیکراں ہے جس کے سامنے ہر بڑے سے بڑے سفینہ کو اپنی سُست رفتاری و کمزوری کا اعتراف ہو جاتا ہے۔ ان کا ذہن بھی گوناگوں علوم کا وہ زندہ مخزن ہے کہ جس کی صحیح قدر و قیمت کا کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر بھی اندازہ نہیں کر سکتا۔ دُنیا کی گیارہ بارہ زبانوں پر وہ کامل عبور و دستگاہ رکھتے ہیں۔ اِن حالات میں کوئی شخص ایسا ہے جو خود بھی ان زبانوں کا عالم اور ایسا دقیقہ رس شاعر و نقّاد ہو کہ خالدؔ کی شاعری میں ہمہ تن غرق ہو کر دُر بے بہا

اپنے دامن میں لا سکے۔ ناممکن ہے۔ اس بحرِ بے کراں کی نہ تو غوّاصی آسان ہے نہ گوہر چینی، وہ تو اپنی شاعری اور کمالِ فن کی وہ وہ شاہکار مثالیں دکھاتے ہیں کہ نظر حیران اور ذہن ابتری اور کم مائیگی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے ؎

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

جو شاعر اپنے فن کا سرچشمہ اسلام کو سمجھتا ہو۔ جس کا خدا پر کامل ایمان ہو اور جسے پیغمبرِ اسلام سے اتنی محبت ہو جائے کہ وہ اپنی ذات ہی کو سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کا اقل ترین کمتر سے کمترین عطیہ سمجھتا ہو اس کی عظمت و رفعت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ خدا، رسُول اور قرآن اُن کے پیکرِ شعر میں رچا بسا ہے۔ کہ ان سے خالد کی علیحدگی کا تصوّر محال بلکہ ناممکن ہے ؎

اِک خانۂ ویراں ہے دلِ بے قرآں
قرآں کہ ہے الکتاب بے ریب و گماں
لَا تَتَّخِذُوا آیاتِ اللہِ ھُزُوا
قرآں ہے ہُدًی لِّلنَّاس والفرقاں

قرآن غزل گوئی پہ غالب آیا
دل اس کے طفیل از سرِ نو زندہ ہُوا
قرآن کو ہم ذکر و ضیا کہتے ہیں
ہر عالم دیا ہل کا ہے یہ راہ نُما

خالد کا پیغام یوں تو ساری دُنیا کے لیے ہے۔ ان کا پیغام ہمہ گیر بھی ہے عالمگیر بھی! اگر بغور ان کے شہ پاروں کا مطالعہ کیجیے تو بے اختیار یہ حدیث یاد آتی ہے۔ بعض صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ کی اُمّت میں کس زمانے کے لوگ بہتر قرار پائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا میری اُمّت کی مثال بارش کے قطروں کی سی ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ اگلے قطرے بہتر رہے ہیں یا پچھلے

بہتر رہیں گے۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ خالد کا کلام بھی ایک کے بعد ایک کا مطالعہ کرنے سے قوّتِ فیصلہ جواب دے جاتی ہے کہ کسے اچھا کہیے کسے بہترین؟ ان کی تصانیف کے ورق پر ورق اُلٹتے چلے جائیں تب بھی بجز معدودے چند نقائص کے ہر ورق ہر سطر اور ہر لفظ حکیمانہ ژرف نگاہی، فلسفیانہ موشگافی اور عالمانہ تنوع افکار کا ایک بیش بہا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ فی زمانہ اردو، انگریزی یا کسی اور زبان کا بڑے سے بڑا شاعر خالد کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ ثمردتِ تصوّرات میں اور نہ ارفع و اولیٰ تخیلات میں۔ نہ حد ان کے پیچھے نہ حد سامنے، وہ تو ماورائیت کی ساری حدیں عبور کر چکے۔ ان کی زندگی واقعی مجمع البحرین ہے۔ جس میں ہر زبان کے علم و فن کے دھارے آکر مل گئے ہیں۔ ان کے ذہن کی وسعت و عظمت سرحدِ ادراک سے اتنی بلند ہے کہ غیر شاعر یا قاری کا ذہن اس حد تک پہنچ نہیں سکتا ان کے یہاں رمزیت بھی بے پناہ ہے۔ فارقلیط میں بہت کثرت سے رمز ہیں۔ جن کو خود شاعر نے الواح میں واضح کیا ہے۔ وہ مجموعہ خود بھی رفعتِ فکر کا شاہکار نظر آتا ہے۔

منحمنّا کی اشاعت نے اسلام پسند حلقے میں مسرّت کی لہر دوڑا دی تھی۔ ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ کسی نے اس تصنیف کو خالد کے کمال کا عروج خیال کیا۔ کسی نے اسے نعتیہ کلام میں بیش بہا اضافہ کا موجب گردانا۔ کسی نے خالد کو نغز گو شاعر کہا تو کسی نے خالد کو آسمانِ شعر کا شہابِ ثاقب کا درجہ دیا۔ اس عظیم و نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے سلسلے میں وہ بحرِ موّاج اور بحر العلوم قرار دیئے گئے۔ لیکن ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اُن کی شاعرانہ عظمت جو داد و ستائش چاہتی ہے اس کی وضاحت اور صراحت کا کوئی ذریعہ دُنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔

خالد صحیح معنوں میں اقبالؔ کے بعد حکیم الامّت اور مفکرِ اعظم کہلائے جانے کا مستحق ہیں۔ ان کی نمائندہ شاعری جو انہیں اپنے متقدمین، معاصرین و متاخرین سے متمیّز کرتی ہے اس کی مستحق ہے کہ خالد کو علّامہ کا خطاب عطا کرے۔

خالد کے کلام کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت مذہبی شاعری کی انفرادیت ہے۔ اظہارِ خیال کی ابتدار سے لے کر اب تک جو خالد نے لکھا ہے اس سے مکمل طور پر اسلامی طرزِ فکر نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری روایتی اسلوب سے بالکل ہٹ کر ہے۔ نہ تو گل و بلبل کے فسانے ہیں، نہ شمع و پروانہ کی داستان، نہ ہجر و وصل کے دکھڑے ہیں اور نہ ہوا و ہوس کی لچر پوچ حکایت۔ یہی بڑی وجہ ہے کہ زمانے نے ان کی شاعری کو بہت دنوں بعد اپنایا۔ لوگ ایک نئی آواز سن کر چونک پڑے اور جس طرح ایک نئے پیغمبر کی تبلیغ اُمّت میں ہمیشہ باعثِ طنز و استہزا رہی ہے۔ خالد کا منفرد کلام بھی معترضین کے نزدیک تضحیک و تمسخر کا سبب بن گیا۔ لیکن ہر بات کا ایک وقت اور ہر اعتراض کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ نئی آواز جو بڑی حد تک پیغمبرانہ تبلیغ کے لئے ہوتی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں اُترنے لگی متاثر کرنے لگی۔ اور اپنا اثر چھوڑنے لگی۔ لوگوں نے اسے اپنایا، دیکھا، سنا اور پرکھا اور پھر فکر و فن کے معیار پر پورا اُترتے دیکھ کر اپنا ادبی سرمایہ اور شعری ذخیرہ سمجھ لیا۔ معترضین اور ناقدین نے محسوس کیا کہ خالد نے محض اپنے سطحی جذبات کے اظہار کے لئے شعر کا ذریعہ تلاش نہیں کیا، نہ ہی وہ روایت پرست ثابت ہوئے ان کا اسلوب سنجیدہ، گہرائی گیرائی لئے ہوئے پُر عظمت اور منفرد ہے۔ انہوں نے اپنا راستہ جب سے الگ بنایا، وہ مذہبی شاعری جو فی زمانہ رجعت پسندی کا شکار ہو کر شعرار کے لئے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی، بلکہ پست و ذلیل موضوعات کی فراوانی اور ناپسندیدگی نے نعتیہ شاعری کو بالکل پس پُشت ڈال دیا تھا۔ خالد نے اپنا اسلوب اسی نعتیہ شاعری کو بنا لیا۔ زاویۂ فکر کو تقدیس دی۔ شعر سے ملک و قوم کی سلامتی کا درس دیا۔ استعماری احساسات کو بقا کا سبق سکھایا۔ ایک ایسا جرأت آمیز قدم اُٹھایا۔ جس پر اُن کی ہمّت کو آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی شاعری ایک خاص اور اہم مقصد کی حامل ہے اور وہ مقصد ہے مذہب اسلام کی بقار اسلام کی محبت، پیغمبرِ اسلام سے عشق! ان خیالات کو خالد نے جو لباسِ شعر پہنایا ہے وہ بالکل نیا اور دلکش ہے۔ ان کا کلام اُن کے دلی احساسات کا آئینہ دار ہے۔ عشقِ رسولؐ میں وہ رومی و حافظ، غالب اور اقبال سے بھی بہت آگے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا زندہ جاوید ثبوت "فارقلیط" اور "منحمنا" ہے۔ ان دونوں کتابوں میں الفاظ کا ایک بحر

ذخار ہے جو موجیں مار رہا ہے ۔ نہ صرف اردو کے الفاظ ، بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کے شیریں ، اور دل نشیں الفاظ جو ان کے آگے پیچھے موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے ، ایک لڑی میں پرو دیئے بعض بعض جگہ تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لئے شاعر کو تنگیٔ داماں کی شکایت ہونے لگتی ہے ۔ نہ صرف یہ کہ ان کا ایک ایک شعر اپنے اندر علم و ادب کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتا ہے بلکہ یہ بھی ایک خاص وصف ہے کہ ہر شعر مترنم اور موسیقی آفریں ہے ۔ مثلاً

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے
کریم الشّیمہ ، جمیل الطّویّہ
تو خیر البریّہ شہِ دوسرا ہے
چلے تو تو خوشبو چلے آگے آگے
بدستِ صبا مجمرِ غالیہ ہے
دلِ خوں شدہ کا قصاص و دیت کا
کبھی خوں بہائے تمنّا سنا ہے
سراپا ستودہ ، سراپا محمدؐ
کسے اس کی توصیف کا حوصلہ ہے
میں شیدوں کی پیاسی میں چرنوں کی داسی
تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے
تو دیپک میں کاجل ، تو درپن ، میں سیسہ
میں کالک تو پربھات کی لالما ہے
میں لوہا تو پارس ، میں کنکر تو ہیرا
میں مٹی کی گڑیا ، تو ابر دھوا ہے

"فارقلیطؐ" کے علاوہ "منحمنّا" میں دیکھئے۔ وہاں بھی یہی ترنم یہی روانی اور یہی تاثر ہے ؎

ترانۂ ملکوتی ، غنائے لاہوتی

نوائے پاک قنوتی کہ جس میں زیر نہ بم

شمار کرنے چلیں اُس کی خُوبیوں کا اگر

تو ساتھ چھوڑ دیں تھک تھک کے نیل سنکھ پدم

پکارتا ہے پیا پے انا رسُولؐ اللہ

خیالِ سُود و زیاں ہے نہ فکرِ مدحت و ذم

ہے اپسراؤں کے نازک لبوں پہ ھیم کُسُم

بنا دیا ہے مسرّت نے سانس کو سرگم

ملوک رسمسے سوشیل سہج سیل وسبھاؤ

رہیں بہار پہ جگ جگ جوانیاں جم جم

محمّد عربی آبروئے ہر دو سرا

حبیبِ پاک خدا ، جانِ عالم و آدم

بہر حال مثالیں کثرت سے ہیں اور طاقتِ اظہار کم۔ ویسے کیا کہئے کہ خالدؔ کا جب یہ حال ہے ؎

فقیر عشقم و مستغنیٔ سر و ساماں

دلیست سوختہ از عشقِ مصطفےٰ دارم

وہ عشقِ رسُولؐ کا اظہار کرتے کرتے ایسے بے خود و بے خبر ہو جاتے ہیں کہ مسرّت ان کی سانسوں کو سرگم بنا دیتی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتے کہ رسُولؐ اللہ کی محبّت میں وہ کتنے ڈوب چکے ہیں لیکن کہتے ہیں ؎

ہے نعت و نام نبیؐ مایۂ مباہاتم

عشقِ رسُولؐ دُنیا کا سب سے عظیم اور مقدس فرض ہے جو خالدؔ نے اپنے ذمّہ لے رکھا ہے وہ نہ صرف قول ہیں بلکہ عمل بھی۔ ان کی روزمرّہ کی زندگی ہی ان کے افکارِ عالیہ کی آئینہ دار ہے۔ خالدؔ اس لئے اور

تعریف و توصیف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے دُنیا کی داد و دہش، تنقید و تبصرہ اور مدح و ذم سے
بالکل بے پرواہ ہو کر اپنا مقصد سب کے سامنے رکھا ہے۔ خالدؔ کی قدر ناشناسی کی بڑی وجہ یہ ہے
کہ ان کا کلام عام فہم نہیں ہے۔ دُوسرے رمز و کنایات سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے اور تیسری وجہ یہ کہ فلسفیانہ اظہارِ
خیال نے کلام کو عام پڑھنے والے کے لئے بھی اور بہت زیادہ عالم و فاضل لوگوں کیلئے بھی پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے۔ ہر شخص
دُنیا کی بیشتر زبانیں نہیں جانتا۔ بہت بڑے فلاسفر اور ڈاکٹر کا مبلغ علم بھی اردو، فارسی، انگریزی سے
آگے نہیں بڑھتا۔ لہذا بہت زیادہ علمیت اور قابلیت صرف کرنی چاہیے عربی دانی اور سنسکرت اور
عبرانی یا یونانی سیکھنے کے لئے، بہر کیف جسے یہ نعمت ملی، وہ نعمت نہیں اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔
بہرحال خالدؔ کا پورا کلام افکارِ عالیہ کا مخزن ہے۔ ان کی شاعری صحیح معنوں میں پیغمبری کا ہے۔

؎ مصنّف کتابوں میں چہرہ نما ہے

لیکن اب بھی ایک دبیز پردہ ناواقفیت اور قدر ناشناسی کا، شاعر اور قاری کے درمیان پڑا ہوا ہے
ضرورت اس کی ہے کہ اس عاشقِ رسولؐ کے عشقِ صادق سے فیض اٹھایا جائے اور یہ دیکھا جائے
کہ ؎

وقارِ سکوت اور حُسنِ تکلّم
اسے دینے والے نے کیا کیا دیا ہے

جعفر طاہر

ملک الکلام

عصمتِ نیاگاں کا یہ مُغنی آتشِ نفس و شاعر شعلہ نوا نہ تو بزمِ اغیار میں نقش بہ دیوار ہے اور نہ ہی فن کا پرچم ہاتھ میں لے کر اپنے جذبۂ پندار سے شرمسار۔ وہ غبارِ خاطرِ آشفتہ خیالاں بھی ہے، مایۂ آرائشِ گلستاں اور سرمایۂ اعتبارِ بتاں بھی۔ اپنے بربطِ حیات پر گاتا بھی ہے اور نغموں کی صدائے بازگشت سُن کر روتا بھی ہے۔ اسے ایوان ہائے شہریاری کے افسانے اور رندانِ بادہ خوار کی داستانیں بھی آتی ہیں۔ اس کے سینۂ جواں میں سنانیں بھی پیوست ہیں اور اس کے دوشِ ہمت پر کڑی کمانیں بھی لٹکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُسے ہوس پرستیٔ محبوب کا ملال بھی ہے اور شیوۂ تسلیم و رضا اور آئینِ اقلیمِ وفا کا پاس و خیال بھی۔ وہ کہنے اور نہ کہنے کی باتوں سے بخوبی ناآشنا ہے۔ اُس کا ہر لفظ نغمۂ زبور کی طرح معتبر اور اس کا ہر نوحہ بجائے خود ایک نئے نالہ گر ہے۔ زندگی کی بوقلموں بساط از رنگ اور حیات کے کارِ صد رنگ کا یہ ذہین و دل گرفتہ تماشائی نہ تو خودی سے بیگانہ ہے اور نہ ہی حکیم فرزانہ ہے۔ ایک باشعور دل جس میں تپشِ پروانہ بھی ہے اور جراٴتِ رندانہ بھی۔ جو محرمِ رازِ درونِ مے خانہ بھی ہے اور زہر و شیرینی کا دلدادہ بھی۔ جس کا مذاقِ رنگینی اور شوقِ گُل چینی توفیقِ عاقبت بینی کا شکار نہیں لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اسے اندیشۂ مآلِ کار ہی نہیں۔ وہ ایک عمر سے یادِ گزشتگاں اور غمِ فراقِ رفتگاں میں صبائے چمن کی طرح دیوانہ اور بگولوں کی مانند آوارہ و بیقرار پھرتا ہے۔ کہیں خونابِ شررتاب، اور کہیں غارت گریٔ حُسن و شباب دیکھ کر بے خود ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا دلِ سوختہ خمیازہ کشِ رنجِ خمار اور کبھی تہیدستیٔ راہ گزار نظر آتا ہے۔ وہ کبھی آرزو خیز اداؤں کے نشے میں کھو کر اور کسی معشوقِ جواں سال کا ایما پا کر تنِ دوشینہ کے اسرار و حکمت کو بے نقاب کرنے لگتا ہے۔ وہ ایک دلیر اور جسور و غیور عاشق

کی طرح ایوانِ زرنگاری اور حجلہ ہائے شہر یاری کے تمام پردے اُلٹ دیتا ہے اُس کا اضطرابِ نہاں جو ملکوتی جلال اور ارضی جمال کی قوّتوں سے مالامال ہے۔ ہر پیکرِ انوار اور حاملِ اسرار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ اور کبھی پردہ گیانِ سرادقِ عصمت و حجاب کے سامنے سحر زدہ ہو کر درماندہ و زار نظر آنے لگتا ہے۔ کسی زُلفِ مشکیں کی عنایات سے بے خود ہو کر دامِ ہم رنگ زمیں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور کبھی فیضانِ ازل اور توفیقِ خداداد کے طفیل طلسمات و نیرنگ کے ہر فتراک سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ علم و ادب کے لازوال اور ابدی سرچشموں سے جرعہ جرعہ پی کر کسبِ قوّت کرتا ہے۔ لیکن خود گدازی اور جاں سوزی کو آئینِ حُسن کاری کی شرطِ اوّلیں سمجھتا ہے۔ کفِ نگاریں پر جلتے جگمگاتے اور جھلملاتے ہوئے چراغ ہائے جام و سبُو، اور دست گل اندوزِ حنا میں لپکتے ہوئے پھولوں کے گجرے دیکھ کر وہ اپنے داغ ہائے دل شمار کرنے لگتا ہے۔ اور کبھی ہجومِ لالہ و گُل دیکھ کر اسے چمنستانِ وحشت کی شیرازہ بندی کا خیال آنے لگتا ہے۔ پُرانی تنقید کی زبان میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے، کہ دُنیا کے خارجی مظاہر اس کی باطنی کیفیات کے اشارے بن جاتے ہیں یا اُس کے باطنی میلانات، رجحانات اور نفسی تاثرات دُنیا کی بیرونی رونقوں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ تخلیق کی لگن میں اپنی متاعِ ہوش و جاں کا زیاں ایک منفعت بخش سودا سمجھتا ہے اور پھر حوصلے، تحمّل، اعتماد اور شرف و فضیلتِ ذات کا یہ عالم ہے کہ زباں پر یہ گلہ تک نہیں ؎

جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

وہ حُسنِ محبوب جو اس کے کلامِ پُرفن کا استعارہ ہے، کے جلووں کو ایمائے ترکتازی دینے کے لئے اپنی جان تک نثار کر دیتا ہے۔ اور اس کی یہ کوشش نذرانۂ نمِ اشک و تحفۂ خونِ من تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ طُرفہ پہلو اس داستان کا یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں دُشمنانِ دیں تک سے استمداد کا طالب رہتا ہے موجِ دریا کو کفِ دردہاں دیکھ کر شاخہائے مرجاں کی بربادی و ویرانی کا ماتم کرنے لگتا ہے اور کبھی سنا برق جلووں اور بے تاب تجلّیوں اور طوفانوں کو حمد و مناجات اور الحاح و زاری کے وسیلوں سے دعوتِ تصرّف و دسترس دیتا ہے۔ شمشیر و شلاق کے سامنے مُسکرا دیتا ہے۔ کہ یہ اس کی نگاہ میں عینِ آئینِ

شرافت ہے۔ اپنے قاتل سے رحم کا طلب گار نہیں۔ اور بوقتِ ذبح اس کی گفتگو کا انداز سرمدؔ کی طرح صمیمانہ و عاشقانہ نظر آتا ہے۔ وہ رندِ پاکباز و پاک بیں جو تہذیبِ نفس کے لئے اگر کنجِ عزلت میں یا کسی غارِ نبوّت ہی خلوت گزینی اختیار کرتا ہے تو دوسری طرف تسخیرِ خوش نگاہاں کے لیئے سررشتۂ ہوس کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ کبھی سُرخ پوش کافروں کو خونِ تمنّا کی سوغات بھیجنے کے لیئے شاہدانِ لالہ قبا کو اذنِ سفارت دیتا ہے اور موجِ ریحاں کی مانند اپنے اورنگِ چمن و مسندِ گل سے اُتر کر جریدہ رو اور آزادِ راحلہ ہو کر کسی سُنبلِ خاک بسر کی زلفوں میں اسیر ہو جاتا ہے۔ کبھی گلبرگ پیکروں، کراچی و لاہور کی پری وشوں، ہیر و ہیلن کی ملاحتوں اور بُریرہ و عذرا کی دلبرانہ نزاکتوں سے کسبِ فیض کرتا اور اپنے ایوانِ ہُنر کی آرائشوں میں کھو جاتا ہے۔ لیکن وہ فرہاد کی طرح کوہ کنی تو بے شک کرتا ہے لیکن مزدورِ طرب گاہِ رقیب نہیں بنتا۔

وہ ایک بڑے فن کار کی طرح ہر مضمحل ادا اور ہر منفعل نگاہ کو دیکھ کر لرز جاتا ہے۔ حیاتِ فانی اور عمرِ رفتہ کی ستم گاریوں پر آنسو بہانے لگتا ہے۔ کبھی کنارِ لبِ جُو مجلس افروز ہوتا ہے لیکن حرف و معنی کا یہ نقاشِ اعظم لالہ و گُل کی صُورتوں میں آسودگانِ خاک کے پاکیزہ چہروں کے خدوخال ڈھونڈنے لگتا ہے۔

دستِ مزدور پر چھالوں کے مٹتے ہوئے نشانوں کی طرح مٹتی ہوئی تربتوں سے دیوانگانِ علم و حکمت اور سرگشتگانِ شرابِ ہدایت و معرفت کا پتا پوچھنے لگتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں ہر خشتِ خم، ہر سنگِ دیوار، ہر نقشِ آستاں، ہر جامِ شکستہ اور ہر بُوئے رفتہ سے اُمتوں، قوموں اور تہذیبوں کے لُٹے ہوئے مدائنوں کے بارے میں بے تاب ہو کر سوال پوچھنے لگتا ہے اور کوئی جواب نہ پا کر خاقانی کی طرح الم انگیز لَے میں نوحہ چھیڑ دیتا ہے۔ لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے کہ وہ حُزن و ملال اور یاس و افسردگی کا شکار ہونے کی بجائے جب ایک توانا اور صحت مند انسان کی طرح غموں کا بوجھ سر پر اٹھا کر ایک نئے عزم و ولولے کے ساتھ اپنے فکری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ گردشِ ماہ و سال اس کی طبعِ رسا کو شکستہ دلی اور کم ہمّتی کی بجائے ایک نئی تب و تاب اور ایک نیا ولولۂ تگ و تاز عطا کرتی

ہے۔ وہ غالبؔ کی طرح ہر نوکِ خار کو آغشتۂ خونِ دیدہ و دل کرنے کے بعد باغبانیٔ صحرا میں لگ جاتا ہے۔ یہ طبعِ وقّاد، یہ عزمِ بلند اور یہ ہمّتِ جلیل اس کی دانشِ ارجمند اور فکرِ سلیم کو تاریخ و تہذیب اور ادیانِ دامم کا ایک راوی فرخندہ فال اور مغنی باکمال و بے مثال بنا دیتی ہے۔ وہ جنّت کے خیابانوں، رامش و رنگ سے معمور شبستانوں، شاہدانِ گلعذار کی برق پاشیوں سے آباد ویرانوں اور صدائے بربط و چنگ سے گونجتے ہوئے مے خانوں کا ایک ہوشمند ناظر اور دیدہ ور تماشائی ہے وہ حدیثِ راز کی دل نوازیوں، قربِ وصال کی قیامت آفرین ساعتوں، ہنگامِ نشاط کے جنوں خیز لمحوں اور شب ہائے ہم آغوشی کی پُراسرار و ہیجان خیز کیفیتوں کا مصوّرِ نادرہ کار ہے۔ متاعِ عشرتِ آغاز کا اداشناس اور حسرتِ انجام و مرگِ آرزو کا ماتمی گوشہ نشیں، اُس کی نگاہ رنگینیٔ تماشا کی فریب خوردہ اور حُسنِ رسوا کی زخم دیدہ ؏

روئے زرد است و آہ درد آلود

مگر وہ دوائے درد رنجوری اور چارہ غمِ مہجوری کا بھی آرزومند نہیں۔ توفیق یاوری و فیضانِ عشق کی بدولت وہ بیمار سپر انداز نہیں بلکہ سربلندی سرفرازی شہرت رنشندگی غرضیکہ اس کی فکر و ہمّت کو ایسی کوئی دوا اور ایسی کوئی اکسیر نہیں۔ اس کے دامن پر غبارِ فقر و قناعت، اقرارِ بندگی و اظہارِ چاکری کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن اس کے لب و لہجے کا طمطراق، اس کی گفتگو کا انداز، اُس کا لُطفِ کلام اور شکوہِ ظرف و ضمیر اس امر کا اعلان ہے کہ

زتختِ جم سخنی ماندہ است و افسرِ کے

میراث خوارگان کی خزینہ داری کو وہ کفر سمجھتا ہے۔ اس کی مروّت، اس کی سخاوت اور ——— اس کے فن کارانہ جود و کرم پر کسی ظاہر داری کا داغ، کسی ریاکاری کا دھبّہ، کسی خودستائی کا عکس اور کسی مہذب ریاکاری کا ٹھپّہ نہیں۔ وہ طریقِ دولت کی چالاکی و چستی سے آگاہ اور اسے مذہب طریقت میں نشانِ کفر اور علم و عقل کی خامی سمجھتا ہے۔ آستانِ جاناں پر سجدہ ریز ہو کر بھی آسمان کی رفعتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی پستیاں فرازِ ہمالہ و طُور تو کیا عرش و کرسی کی بلندیوں پر بھی خندہ زن

نظر آتی ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں یا دوسرے لفظوں میں جادۂ علم و ہنر پر وہ جس ذوق و شوق سے قدم فرسا ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں لیکن اتنا تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ وہ یارانِ جادہ پیما کو بہت پیچھے چھوڑ کر کہیں آگے نکل چکا ہے۔ اس کے رفیقانِ سفر تھک چکے ہیں، بلکہ بہت سے تو کمرِ ہمّت کھول کر نعمت و دولت کی چھاؤں میں اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہے کہ ایک شہریارِ جری دل کی طرح فکر و فن کی نئی سے نئی اقلیمیں برابر فتح کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے تاجِ فضیلت میں ہر مملکتِ صنف تو ایک گوہرِ تابدار بن کر جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ نئی، نرالی، مگر نہایت ہی کٹھن راہوں کو اپنی سمن پوش بانہیں کھول دینے کا حکم دیتا ہے۔ ان کی گرد آلود پیشانیاں اپنے مُوقلم سے چُوم چُوم کر منوّر و تاباں کر دیتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ رندانِ خراباتِ بادۂ سرجوش کے انتظار میں چشمِ ساقی کی طرف دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے دستِ جراں میں جامِ خورشید لے کر مستانہ وار اٹھتا ہے اور درِ قدس پر دستکیں دینے لگتا ہے۔ ایک ذرہ جو صحرا دستگاہ، ایک قطرہ جو سمندر پناہ اور ایک سیارہ جو ہفت آسماں کو اپنی جولاں گاہ بنائے ہوئے ہے۔ ایک شاعر جو مَلِکُ المہر اور سلطانِ ارضِ مشتری و ماہ ہے اس کی چشمِ ارجواں مایہ اندوزِ بصیرت ہی نہیں، بلکہ دُوسروں کے لئے بھی نکتہ آموزِ حقیقت ہے۔ وہ عصرِ حاضر کا ایک بالغ نظر فرزند اور ایک عاشقِ دلیر و ہوشمند ہے۔ ایک ایسا عاشق جو اپنے گریبان کے ہر چاک کو صد اَفتوں کا عَلَم بنا کر بے یقینی اور بے اطمینانی کے اس دور کو ایک فلسفیانہ حکمت آموزی اور ایک قلندرانہ تڑپ کا درس دیتا ہے۔ اس کے کفِ دستِ آبلہ دار میں مُرکبِ عُمرِ گریز پا کی جھجھاتی ہوئی عنانیں ہی نہیں بلکہ جیسا ابتدائے کلام میں عرض کر چکا ہوں۔ اس کے دوشِ ہمّت پر عرب کے جیالے، جگر دار من چلے، باغیرت اور البیلے گھیلے شاعروں کی طرح لانبی لانبی کمانیں بھی ہیں۔ اس کی شاعری میں مَلِکُ الضّلیل، ذوالقروح یعنی امراء القیس کی آوارگی اور شوریدہ سری، اسی کی سی عظمت و سرمدی، گرمجوشی، مجلس آرائی اور ایک شوکت و سطوت ہے۔ اسی کی طرح مشکل الفاظ کی کثرت، مگر شعروں کی عمدہ بندش، ندرتِ خیال اور حُسنِ تشبیہہ و استعارہ ہے اور بے مثال ہے۔ جب وہ

مشکل پسندی سے دامن بچا کر چلتا ہے تو پھر نابغۂ ذُبیانی کی طرح مضمون کی صفائی اور حُسن و نزاکتِ لفظی اور تکلف و تصنّع سے پاک اشعار دُنیا کی عظیم ترین بیانیہ شاعری کے پس منظر میں بھی عظیم تر نظر آتے ہیں، مگر ایسے اشعار وہی ہیں جو اُس کے جنسی میلانات اور عمرِ فانی کی حسین ترین خواہشات کی زبان بن جاتے ہیں۔

بظاہر اُن کے بدن پھُول سے بھی نازک ہیں
کہ جن سے اُٹھتی ہے تازہ بتازہ تُو بر تُو
مہک گلاب کی، بادِ بہار کی خوشبُو
مشامِ آرزو آسودہ شوق بے قابُو
دمِ خرام لچکتے ہیں شاخِ گُل کی طرح
تمام دامش دریچاں، تمام دستنبُو
ہے کارخانہ نگاہوں میں، شرم و شوخی کا
وہ سینے کا گہریں مخملیں بلور ستاں
ہے جس میں نازکی پھولوں کی، جوش موجوں کا
فروغِ رنگِ بدن سے لباس گلگوں ہو
رگوں میں خون جوانی کا کف کرے پیدا

(ورق ناخواندہ - گنجِ رنجِ رایگاں)

لیکن بات صرف دلبری و کارگاہِ عشوہ گری تک محدود نہیں رہتی۔ ہر چند کہ اسرارِ عشق و مستی کی نقاب کشائی کرنے کے لیئے وہ بار بار فریب نرگسِ مخمور و لعلِ مے پرست کا شکار ہو جاتا ہے وہ باغِ اِرم اور نخوتِ شدّاد تک کو ایک شیشۂ مے اور نوش لبی پر قربان کر دیتا ہے۔ وہی عرب شعراء کی سی کریمی و عطا بخشی، اس کی طبیعت کی بیقراری، ذوق و شوق کی شدت، دل کی آشفتگی سودا زدگی و شوریدہ سری، جذب و جنوں، خوش آئندہ تخیلات، دھندلی دھندلی فضاؤں اور تابناک

پہنائیوں کی ملی جلی کیفیتیں یہ سب کچھ اس کے عربی مزاج کے کرشمے ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے رومانیت کہہ لیں، چاہے کلاسیکیت لیکن اس کے اسلوب وخیالات، جذبے کی حدّت اور وجدان کی کمیت و خاصیت میں خالصتہً عربی فضا کا عمل نمایاں طور پر ملتا ہے۔ لیکن اس کی رومانیت بے ترتیب نہیں اس کے خیالات میں بے ربطی نہیں، البتہ آزادہ روی اور وسعت مشربی کے پیش نظر وہ دُنیا بھر کی روایات واساطیر اور قصص وصنادید کا احاطہ کر لیتا ہے اور یوں دینِ جاہلی کے ان پیمبروں کی شریعات نانوشتہ میں نئے سے نئے صحیفوں کا اضافہ کرتا ہے۔ اس رنگِ طبیعت، اس اندازِ بیاں اور اس ذوقِ جمال کو کیا نام دیجیے گا۔

حُسن و نغمہ مری لَے، شعر مناجات مری
مجھے قرآن سُناتی ہے نسیمِ سحری
نازنینانِ ادا مست صُراحی در دست
کریں رندان قدح خوار کی خاطر داری
باہیں مالا کی طرح اُن کے گلے میں ڈالیں
روپ کے نشے سے بدمست جوانی ماتی
آتشِ تر کی طرح جلتے ہیں بھیگے ہوئے مُنہ
ہے کوئی رنگ رتی اور کوئی انگ متی
سخنانِ طرب انگیز کہیں مستی میں
جسم کی لذتِ فانی کو بنائیں ابدی
ہے دلِ زار کو ترتیب جہاں سے بڑھ کر
ایک شب ریشمی ملبوس کی بے ترتیبی

اِن اشعار کو پڑھ کر Keats کی نظم The (EVE OF ST. AGNES) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

خالد ایک جوان خوش رو، خوش خُو، حلیم وسلیم، متواضع، خلیق، خدا پرست اور وطن دوست ہے

ہر بڑا شاعر ان اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ رندِ شاہد باز اور شخصِ چنگ و رباب زدہ درویش دلریش، رندِ ہزار شکوہ اور مردِ جبری پیشہ بھی ہے۔ اور یہی چیزیں جہاں اسے ملک الکلام بنا دیتی ہیں وہیں اسے ملک العیّاش کہلانے کا بھی مستحق ٹھہراتی ہیں ع "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" اس مصرعے کی عملی تفسیر دیکھنا ہو تو اس کی شاعری ضرور پڑھیے۔ انسانی فطرت کی خوبیوں اور کمزوریوں کا اتنا حسین اور پائدار نقش آپ کو جدید اردو ادب میں شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ یہ مرتبہ شناس علمار اور قدردان فضلاء و بلغا، خود گنجینۂ علوم کا خزینہ دار ہے لیکن سادہ رویانِ گلعذار و سرو قدانِ لالہ رخسار کی زلیخائیوں اور نگہ ناز کی غلط اندازیوں کا شہیدِ سعید بھی۔ ہر چند کہ اس کی تمام شاعری حیاتی اور حواسی نہیں لیکن اس کے کلام کی یہی ایک وہ بنیادی خصوصیت ہے جو اردو شاعری کو اس کی عطا ہے تشبیہات و استعارات اور اس کی زبان و حسنِ کلام کی بات تو بعد میں ہو گی۔ فی الحال مجھے اتنا عرض کرنا ہے کہ اس کی شاعری میں عورت کا بدن جس آب و تاب سے جلوہ گر ہوا ہے وہ ارفع شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ میری نظر میں ن م راشد کی جنسی ترکیبیں اور شہوانی تشبیہیں بھی ہیں (اور یہ مجھے پسند ہیں) فیض کے نگارانِ نوساختہ کے مہندی بھرے ہاتھ اور ان کی تار ہائے مقیش سے تمتماتی اور جگمگاتی ہوئی مانگیں بھی ہیں۔ لیکن خالد کی بات اور ہے ؎

نشۂ حسن و جوانی سے دمکتے چہرے
بارِ پستاں سے شجر ہائے ثمر دار بنے
سخت پتھر کی طرح، نرم بُسانِ ریشم
پنڈلیاں جیسے ستونِ عاج و درِ دوم کے
سونڈ ہاتھی کی خجل جن سے وہ چکنی رانیں
دامنی بن کے لپکتی وہ مدن بان آنکھیں
کوڑیالے سے بالوں کو، گریباں کھولے
ساعد و سینہ و رخسار سے لپکیں شعلے

جھومے باغوں میں پڑے مست پپیہا بولے

قُلزم شوق میں جذبات کی نیّا ڈولے

جیسے دنیس میں سر شام رواں گنڈولے

(برگ خزاں۔ فلکناز)

آخری شعر پڑھ کر Walter Richard Sickert کی تصویر" دی لیڈی ان دی گنڈولا" آنکھوں کے سامنے تیر گئی۔ بحر موّاج کو پس منظر میں رکھ کر تھرکتے ہوئے جسموں کو ڈولتے ہوئے گنڈولوں سے تشبیہہ دینا اس کی بالغ نظری کا ثبوت ہے اور پھر سمندر کی لہروں کے زیر و بم سے جس طرح جنسی جذبات بیدار ہوتے ہیں وہ بجائے خود ایک آشوبِ قیامت سے کم نہیں۔ دجلہ و نیل کے کلاسیکی کناروں اور ان کی رومانی شاموں سے کون پڑھا لکھا بے خبر ہے۔ خلفائے بغداد ہی نہیں بلکہ ابوالکلام آزاد تک انہی زرنگار بجروں میں بیٹھ کر کوئے بتاں کے طواف کو مدہوش کن چاندنی راتوں میں تنہا نکلا کرتے تھے۔ ادب کی یہی وہ روایت ہے جو خالد کے ہاں پروان پا چکی ہے۔ اس کی عوامی اور حسیاتی شاعری نے اضمحلال، انتشار، کرب اور خلفشار کے اس دور میں ہمارے ذوقِ جمال کی آبرو رکھ لی ہے۔ جہاں شب و روز سر بفلک کارخانوں کے سیاہ بطن اور مرگ آفرین چمنیوں سے دھوئیں کے بھبکے اور گرد آلود بادل اٹھتے رہتے ہوں وہاں ان برق پاروں کی زخشندگی و تابندگی امواجِ نور کا حکم رکھتی ہے۔ ہماری زندگی کی تلخیوں، نامرادیوں، حسرت نصیبیوں اور درماندگیوں کا اس طرح کچھ نہ کچھ ازالہ ہو گیا ہے۔ راتوں کے درد میں اب افاقہ سا محسوس ہونے لگا ہے۔ اور جینے کی آرزو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہمارے تہذیبی اور معاشرتی شعور کی سنگین حقیقت میں رومان کی یہ سجل اور گلابی گلابی دھاریاں بہت پیاری اور بھلی بھلی لگتی ہیں، پینگیں لیتے ہوئے جسم، چاندنی کے نرم شیتل سانسوں کی آنچ میں پگھلتے ہوئے آبگینے لرزتے ہونٹوں کے برہنہ شانوں پہ آتشیں بوسے، لب شیریں تھوے میں شکر گھولتی ہوئی نازنینیں مدبھری انکھڑیوں کے چھلکتے ہوئے کٹورے۔ ملیحان طرحدار غزالانِ غزل بیکرسے کوہ وا، ابھرے اور پھر ؎

نقاب پوش سُلگتی ہوئی سیہ آنکھیں
کنک کنک جیسے ارج، انگ، اگن، انوپ اپار
سمکھ، سروپ سلوچن، جگر جگر سکمار
لب و نگاہ میں رمز درضائے بوس و کنار
کہ جیسے آتشِ پنہاں سے دہکے شاخِ چنار

(دشتِ شام۔ تلاش)

چنانچہ آپ ان اشعار میں گونگی پہیلیاں اور جوانی کی اَن کہی بجھارتیں نہیں پائیں گے۔ احساسات کے نغموں کی یہ آواز ظرفِ تہی کی صدائے بے معنی نہیں بلکہ اس کے احساس و اسلوب اور اس کے فکر و نظر کے آہنگ کی صوتِ مردانہ ہے۔ ان شوخ، تیز، بھڑکیلے اور عوامی و مقامی رنگوں میں ہماری ثقافتی روح کا حُسن اور جاہ و جلال ہے۔ جھنگ کے شبنمیں ٹیلوں اور ساہیوال کی شباب پرور راتوں کی طرح روہی کے سبزہ زاروں اور کوہستانِ مری و کاغان کے آبشاروں کی طرح یہ لچکتے لہراتے ہوئے سم ترصرف حسین ہیں بلکہ زندگی کے تحرک و وجدان کے علائم بھی ہیں۔ میں یہاں حروفِ تہجّی کی غنائیہ خوبیوں پر بحث نہیں کروں گا۔ البتہ اتنا عرض کروں گا کہ اگر آپ اِس بند کو پڑھنے کی طرح پڑھیں تو آپ کو خالد کا فن الف واؤ، یا —— آر اور نار کی آوازوں، ان کی صوتی تکراروں اور ان کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی گونجوں میں واضح طور پر نظر آئے گا۔ اردو شاعری میں VOWEL TECHNIQUE نہایت ہی اچھوتی اور نرالی ہے۔ اور اب مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجئے کہ فن شخص و اسلوب کے اسی تعلقِ باہم، اسی رشتہ محکم اور اسی ربطِ بے مثل کا دوسرا نام ہے۔ قامتِ فکر پر لفظوں کی قبا اسی وقت سجتی ہے جب فکر و لفظ میں روح و بدن کا پیوند ہو۔ جب سمندر کے خروش اور صحرا کی خموشی میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ جب لحانِ مغنّی اور نوائے سرمدی میں کوئی حجاب حائل نہ رہے۔ جب ساز اور پردۂ ساز کا امتیاز مٹ جائے اور جب تک یہ حجابات اور یہ پردے حائل رہتے ہیں ایک فن کار کو اس بات کا احساس رہتا ہے کہ اس کے افکار کو ابھی تک ساحل نہیں ملا۔ اس کی نگاہ تیرہ و تار ہیولوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور وہ بے ساختہ

پکار اُٹھتا ہے ؎

اِک دھندلکا سا نظر آتا ہے تا حدِّ نگاہ
اے دریغا! یہ مری گمشدگی کا عالم

(زرد داغِ دل۔ رقصِ شرر)

اور جب وہ الفاظ اور جذبے کا رابطہ درمیاں پا لیتا ہے (اس کے فن میں جنّتِ گم گشتہ اس بات کی دُوسری بڑی علامت ہے) تو اسے محسوس ہوتا ہے ؎

آہ الفاظ کا سیلاب ٹھہرتا ہی نہیں
روزِ اوّل سے ہی محسوس کیا تھا مَیں نے
کہ محرّک ہے کوئی ارفع و اعلیٰ جذبہ
کوئی آدرش کوئی شوخ سُہانا سپنا
ان جگر تاب مسائیٔ جمیلہ کا شباب

(ورقِ ناخواندہ۔ چراغِ تہِ داماں)

اور یہی جگر تاب مساعیٔ جمیلہ رُوحِ فن کار کی پُرتاب تگ و تازِ جلیل ہے۔ نہ تو زنجیر و سلاسل میں اسے جکڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی رفعتِ پرواز کو کوئی چُھو سکتا ہے۔ ایک خالق و فن کار کی رُوح جذب و سوزِ دروں سے لرزاں اور متلاطم رہتی ہے اور یہی رُوح تشنہ کامانِ ادب کے لئے جیحون و فرات بن جاتی ہے۔ فکر و احساس کا یہی اضمحلال ایک فن کار کے دل کی لگن اور حقائق اشیاء کی دریافت و طلب کے لئے ایک سچّی تڑپ ہے۔ حزن و اندوہ میں ڈوبے ہوئے یہی لمحے بہائے تخلیق اور دانشِ دہر بن جاتے ہیں۔ اس کے ہاں بے سود خیال آرائی نہیں۔ اس کے جذبوں کے ربابِ ذہن رسا کے مضراب سے بجتے اور تپشِ ذوقِ سلیم سے آتشیں نغموں کے روپ میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اس کی طبعِ مضطر کی یہ خاصیّت ہے کہ وہ PURGATORIAL SHADOWS کی بجائے اپنی دُنیا کے سانولے سلونے محبوبوں کے چہرے دیکھتا ہے اور ایک عظیم اور بڑے فن کار کی طرح وہ یہ مناظر اور یہ رنگ بھی دیکھتا

ہے ہمیں بھی وہی دکھاتا چلا جاتا ہے۔ میں اسی کو قدرتِ بیان اور حسنِ سخن کہتا ہوں ؎

مثالِ مالبِ دریا وحالِ مستسقی ست

دہند شوق و بے رخصتِ نظر ندہند

شکنتلا کوئی پہلو میں سند آرا ہو

کوئی رمیکیہ بربط پہ نغمہ پیرا ہو

نگارِ ارمنی کوئی، کوئی مدھو بالا

کوئی سلومی و سیفو، کوئی قلوپطرہ

چلیں بیادِ حریفاں شرابِ ناب کے دَور

سلگتے بجھتے جھروکوں سے جھانکتے چت چور

سجل سڈول بدن کام رُوپ من کے کٹھور

کچھ اس قبیل کی نرمی خرام ناز میں ہو

کہ جیسے چوٹ پہ کرتے ہیں ہلکے ہلکے ٹکور

(زنجیرِ رمِ آہو۔ اختر شناس)

یہ احساسِ حُسن وجمال اور سوز وساز کہ سرچشمۂ شاعری ہے۔ اس کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو تفصیلی مطالعہ کا طالب ہے۔ اس کے نزدیک مقصدِ شعر ترسیلِ خیال وجذبہ کا وسیلہ ہے، جلبِ زر کا آلۂ کار نہیں۔ وہ ہر باضمیر اور عظیم شاعر کی طرح یہ راز اچھی طرح جانتا ہے کہ ہر نئے دور کو ایک شاعرِ تازہ نواد نادرہ کار کی تلاش وجستجو رہا کرتی ہے۔ اور یہ کہ ایک سچّے شاعر کی تحریر میں اس کا لہو شعلہ بن کر نور گستر ہُوا کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے کا مسیح ہوتا ہے بلکہ مصلوب بھی۔ وہ عصمت وتقدیسِ حریمِ عصر کی گواہی دینے کے لئے کانٹوں کا تاج سر پر رکھ کر تلواروں کے سائے میں سانس لیتا ہے۔ شاعری میں یہی وہ لمحہ ہُوا کرتا ہے جہاں ماضی حال میں زندہ ہو جاتا ہے۔ یعنی شاعر اپنی مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی اور علمی وادبی روایات کی مسکراتی ہوئی کرنوں کے زانوؤں پر لیٹ کر حال کے گریزپا لمحوں کی چنچل

پریوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ ہومر، بالمیک، کالی داس، ہالڈرلین، ہائنے، گیٹے، نطشے، ورجل، انیس غالب، اقبال، میر آبائی اور مادھو لال حسین سب کے سب جی اٹھتے ہیں۔ وہ کلمۃ اللہ بن کر شاعر کے رگ و پے میں اتر جاتے ہیں اور ایک مجبور و بے بس بشر وقت پر فتح پا لیتا ہے۔ اوّل ما خلق اللہ القلم میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ جیسے ہر نئی کائنات کی شب تاریک میں ایک خورشید تازہ بن کر ابھرتا ہے اسی طرح ایک بڑا شاعر سرچشمۂ فکر و فن سے مئے نظر تاب کے ساغر بلوریں بھر بھر کر پلاتا اور دلوں کے شیشہ ہائے زنگ آلود کو جگمگا دیتا ہے۔ وہ معاشرے کے ناپاک دامن سے داغ دھونے شروع کر دیتا ہے اور اپنی اسی کوشش و کاوش میں ایک دن اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ خالد بھی اپنے ادب کے ذریعے حسن و آزادی، بے ریائی و خوش نوائی، حق جوئی و جہاں آفرینی کا پیام دیتا ہے چنانچہ آپ نے دیکھا کہ انکی شخصیت رومانی بھی ہے اور غیر رومانی بھی، عاشقانہ بھی ہے اور مصلحانہ بھی۔ مومنانہ بھی ہے اور کافرانہ بھی۔ عارفانہ بھی ہے اور فاسقانہ بھی (اور شکر ہے کہ منافقانہ نہیں) اس کی طبیعت کا جائزہ خیال انگیز تو ہے مگر اختلاف خیز ہرگز نہیں۔ وہ حد درجے کا آشفتہ مزاج ہے مگر اس کے یہاں عقلی اصول بندی بھی ہے۔ پڑھا لکھا اور مہذب سوسائٹی کا فرد بلکہ ایک افسر ہے۔ لیکن ساتھ ہی رند لاابالی اور مست مئے افکار ایک مرد جلالی بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

وداع و وصل کے دیوان کا مصوّر ہوں
زبور حرف و حکایات کا مفسّر ہوں
حکیم لاادری، رند لاابالی ہوں
خطیب شعلہ نوا، مطرب جمالی ہوں
ترانہ بوالہوسوں کا، دکھی دلوں کی پکار
سرود خانۂ ہمسایہ، حسن راہ گزار
نوائے عاشق مہجور و صوت صلصل و سار
مؤلف عبرات و مصنف نظرات (برگ خزاں۔ تابیل)

اور یہی ایک سچّے شاعر کی تعریف ہے اور اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ میر و اقبال بڑے شاعر ہو کر بھی شاعر کہلانا نامحبوب و نامرغوب سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس خالد واضح اور واشگاف الفاظ میں کہتا ہے۔ ؎

مجھے کچھ اور نہ سمجھو، میں فقط شاعر ہوں

چنانچہ وہ جو ایک افسر ہے، ایوانِ ادب کا ایک ممتاز و منفرد رکن بھی ہے۔ مشاہدۂ کائنات اور تمدنی تحوّلات و تبدّلاتِ عمرانی کے مطالعہ سے اس کے فن میں وسعت، تازگی، کشادگی، سچائی اور حُسن کی رونق و رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے علم کے زینے سے تخیّل و اکتساب کے بامِ بلند تک پہنچا ہے۔ لیکن شاعری اُس نے کتابوں سے نہیں سیکھی۔ شاعری کتابیں پڑھنے سے آتی تو مولانا جامی فردوسی اور حافظ و خیّام سے بڑے شاعر ہوتے اور خود ہمارے زمانے میں حفیظ جالندھری کی غزلوں میں یہ بانکپن اور گیتوں میں یہ سوز و ساز نہ ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ زبان و بیان کی جزالت و بلاغت کے بغیر ایک شاعر اظہار و ابلاغ کی مکمل ترین صُورتوں سے شناسا نہیں ہو پاتا لیکن اس کے لئے بھی اس کی دستگیری شاعروں کی شاعری ہی کرے گی نہ کہ علم کتاب اور لُغت و فرہنگ کے پشتارے۔ زبان اہلِ کلام کی دریوزہ گر ہے۔ وہ صاحبانِ کمال کی دست بستہ کنیز ہے اور اہلِ ہُنر کی ساختہ و پرداختہ۔ اگر قواعدِ صَرف و نحو ہی سب کچھ ہوتے تو صاحبِ قاموس ہی کی گردن شبِ زفاف ہی کو تن سے جُدا ہو گئی ہوتی لیکن لُغت و فرہنگ اور منطق و معانی پر مجنوں کے ایک شعر کا یہ احسان رہ گیا کہ صاحبِ قاموس غلط محاورہ بول کر بھی جان بچا لے گئے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ خالد کی فکر میں جذبہ و تعقّل کا امتزاج ہے۔ یہاں اضطرابِ دلِ مجنوں اور چشمک ہائے لیلیٰ کے ساتھ ساتھ پاسبانانِ درِ خیمہ اور جوانانِ قبیلہ کا حزم و احتیاط بھی ہے اور جہاں دریدہ و گرم و سرد چشیدہ آنکھوں کی دروں بینی اور ژرف نگاہی بھی۔ یہاں موجِ نکہت بھی ہے اور دُودِ نالۂ دل بھی۔ نوائے رنگیں بھی ہے اور آہِ درد آلود بھی۔ چراغِ فصلِ بہار بھی ہیں اور داغہائے دامنِ روزگار بھی۔ تخلیقِ حُسن اور حُسنِ تخلیق کی انہی کروٹوں کا نام فن ہے۔ ان کروٹوں میں سایۂ دُستانِ چمن کی انگڑائیاں

کا صاحبِ حُسن اور پہلو بدلنے والی نرمیاں بھی ہیں۔ توازنِ حرکت اور جمال و جلال کے اوصاف کا مساوی طور پر پایا جانا اس کے فن کی وہ فصلِ ممیز ہے جو اسے اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار شعراء سے جدا کر دیتی ہے۔ مانا کہ وہ ایک بڑا شاعر ہے لیکن بات صرف روح الامیں سے داد پانے، اور نوائے سروش تک رسائی حاصل کرنے کی نہیں، یہاں لب و لہجہ کی پرورش اور اپنی آواز کو مرمر کر پالنے کا سوال ہے اور اس کے لئے ایک نہایت ہی مخصوص مزاج، ایک شاعرانہ افتادِ طبع، ایک قلندرانہ بے نیازی، ایک عارفانہ خود آگہی، ایک شاہانہ تاب و تمکنت اور ایک فلسفیانہ فہم و ادراک کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ؏

ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

اور جسے یہ دولتِ سرمدی ملتی ہے وہ جوہرِ اندیشہ اور خونِ دل کی آمیزش سے اپنا نظامِ فکر تعمیر کرتا ہے۔ حُسن، آرزو، ترک و طلب، رَم و رغبت، گرفت و گریز، تسلیم و رضا، صبر و ایثار اور ذکاوت و جنوں جذبے کے بنیادی موضوع ہیں۔ یہی خیال و عمل کے محرّکات بھی ہیں۔ غالبؔ نے اسی بات کو

؏ جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

کہا ہے۔ لیکن جس طرح غالبؔ یا بیدلؔ کے کلام میں لفظ آئینہ کی تکرار اور اس کا مختلف پیرایوں میں اظہار ان دو بڑے شاعروں کی تمام فنی اور شاعرانہ خصوصیات کی تصویریں دکھاتا ہے۔ خالدؔ کے کلام میں ایسی کوئی علامت نہیں۔ البتہ اس کا ایک اپنا نظامِ فکر ہے جو مضبوط و مستحکم ہے۔ ہر چند کہ وہ غالبؔ کی طرح مظاہرِ خارجی کی توصیف کرتا ہے اور تعقّل کی راہ سے یہ باتیں اس کے وجدان کا جزو بن جاتی ہیں۔ پھر بھی اس کا اپنا فکر و شعور خلّاقانہ اور فن کارانہ ہے۔

آج شاعروں کی بھرمار ہے اور ایسی حالت میں جب ملک کا ہر تیسرا شخص اور ہر چوتھی عورت شاعر ہو ارفع و اعلیٰ شاعری کا معیار نہیں رہتا۔ اور ہمارا معاشرہ قریب ترین ادوار میں جن عظیم معاشی تبدیلیوں، ہجرت اور نقل مکانی کی صعوبتوں اور زندگی بسر کرنے کی مشکلوں سے دوچار رہا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خیالات و رجحانات میں ایک نئی بلکہ کئی طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں

یہاں تک کہ لوگ اپنا آبائی دین چھوڑ چھوڑ کر ملتِ اغیار میں شامل ہونے لگے (ڈاکٹر محمد داؤد رہبر کا عیسائی ہوجانا ہماری معاشرتی اور ادبی زندگی کا بڑا المیہ ہے) اور خیالات کی یہ تبدیلی ادب میں نئی نئی تحریکوں کا باعث بھی بنی۔ فحاشی، عریانی، جنسی بے راہ روی، خویش پروری اور ادبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہمارے ادبی معیاروں میں بھی بہت کچھ کمی بیشی ہوئی۔ ترقی پسند تحریک ایک توانا فعّال، بہتر زندگی کی نقیب اور علم و ادب کی علمبردار بن کر اُبھری لیکن افسوس کہ وہ بھی شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی۔ ادھر ہماری ادبی تحریروں میں ہنگامی موضوعات اور تحریک جنسی راہ پاگئی۔ لہٰذا زبان اپنی فضیلت اور متانت کے باوجود عامیانہ اندازِ بیان، غلط محاوروں اور سوقیانہ لفظوں کی معجُون مرکّب بن گئی۔

لطف کلامِ صحیح، شستہ و رفتہ اور نتھرے سُتھرے الفاظ کا رہینِ منّت ہُوا کرتا ہے۔ اور لفظوں کی تسخیر کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اِس مہم کو سر کرنے کے لئے جس اسلحہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ فیضانِ الٰہی کہلاتا ہے۔ طبیعت کا اعتدال، مزاج میں نرمی، خیال کی شگفتگی، جذبے کا جوش و خروش، حُسنِ فطرت سے آشنائی۔ اور ان سب کے پیچھے علم کی طاقت۔ یہ باتیں اگر کسی فردِ واحد میں جمع ہوں تو پھر اُسے الفاظ کا عرفان حاصل ہوسکتا ہے۔ علم کے بغیر سوز و گداز، درد و غم، سپردگی و خستگی اور ہمہ گیر تخیّل کے بغیر شعر گوئی محض جان کا زیاں اور خسارے کا سودا ہوگا۔ علم جذبے میں ایک نمایاں شستگی و سنجیدگی پیدا کرتا ہے اور یہی رکھ رکھاؤ الفاظ کا روپ بدل کر زبان کو حُسن، شرافت اور تہذیب کا معیاری وقار بخشتا ہے۔ زبان ہماری سیاسی، جذباتی، معاشرتی، علمی، اخلاقی، مذہبی اور ادبی و معنوی رُوح کی سرگزشت بن جاتی ہے۔ اور ایک اچھا شاعر اسی لئے اچھا شاعر کہلاتا ہے کہ وہ الفاظ کا مؤثر طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ ان وسیلوں کو بہتر طور پر کام میں لاتا ہے۔ جہاں وہ خود کی ترجمانی کرتا ہے وہیں زندگی کی بھرپور تجلّیات کی عکّاسی بھی کرتا ہے۔ اور اس کے کلام اور فن کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا جاتا ہے اس کے کلام میں آفاقیّت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور ادب میں نقد و نظر کی صالح روایات جنم لیتی ہیں۔ ادب اور پروپیگنڈے یعنی شراب اور سرکے کا فرق واضح طور پر محسوس ہونے لگتا ہے۔

ظاہر داری، سخن فروشی، خود ستائی اور مہذّب ریاکاری کے اس زمانے میں خالدؔ کی زبان شرافت

تہذیب، جوہرِ ذات، حُسنِ حیات، حقائقِ اشیا، وسعتِ امکانات، قوّتِ استدلال اور طبعِ سلیم کی زبان ہے۔ کھوکھلے ایوانوں میں زر و سیم کے گونجتے ہوئے خالی قہقہوں سے یہ آواز بہت ہی مختلف ہے اس میں ملاحت ہے، صباحت ہے، شیرینی و شوخی ہے اور وقار و متانت ہے۔ یہ طلسمات آرائی اور دانش آموزی کی زبان ہے۔ اس کا ظاہری رنگ و روپ حسین و جمیل ہے اور اس کی باطنی سطح عمیق و دلکش۔ سمندروں کی رنگ رنگ اتھاہ گہرائیوں کی طرح ایوان ہائے باصرہ فروز سے شاداب و معمور۔ اس کا اندازِ کلام ایک عالمانہ طرزِ تخاطب، ایک فلسفیانہ فکر و استدلال اور ایک شاعرانہ تڑپ کا آئینہ دار ہے۔ جذبے اور تعقّل، خرد اور جنون، خودی و بے خودی کا ایک حسین مجموعہ۔ اثباتِ ذات کے سلسلے میں منطقیانہ دلیلیں لاتا ہے۔ لیکن ہر چیز میں شک بھی کرتا ہے۔ شرفِ انسانی کا دلدادہ ہے۔ پیکرِ خاک کی عظمتوں کا قائل ہے لیکن فطری اقتضادات کی تکمیل کے لئے بے احتیاطی کا درس بھی دیتا ہے ؎

یکدست بمُصحفیم و یکدست بجام
گاہ مردِ حلالیم و گہے مردِ حرام
مائیم دریں گنبدِ فیروزہ فام
نے کافرِ مطلق نہ مسلمانِ تمام

چنانچہ شعر و ادب جذبے اور قوتِ متخیّلہ کے میل تال کا کرشمہ ہیں۔ اور اگر کلام میں ان عناصر کی آمیزش نہ ہو تو وہ سپاٹ، بے جان، سرد اور ایک ٹھٹھری ہوئی لاش کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ ہر تخلیقی فن پارہ جذبے ہی کے تحت وجود میں آتا ہے۔ لیکن پڑھنے والے کے دل میں اگر یہ جذبہ نہ ہو تو، یا پڑھنے والے میں جذبہ تو ہو مگر اُسے علم نہ ہو اور وہ اس فن پارے کی رمزیت، اشاریت اور معنویت کو نہ پاسکے تو، ظاہر ہے کہ جس طرح لکھنے والے میں جذبے اور فکر کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح پڑھنے والے میں بھی کچھ نہ کچھ جذبے اور علم کا ہونا لابدی ہے۔ لیکن یہاں بات شاعر کی ہے قاری کی نہیں۔ اور شاعری تازہ کاری یا تخلیق کا دوسرا نام ہے۔ شاعری زندگی کو نئے سے نئے افق دکھاتی ہے وہ ہماری

نئی سے نئی جہتوں اور سمتوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ قومی اور ملکی زندگی کے محدود دائرے کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ خالد کے چند شعر سنیئے ؎

میں ہر دیار و ولایت کے زائر و سیّاح
سے جا کے ملتا ہوں شاید کسی نے اجاناً
تمہاری خوشبوئے عفّت مآب سونگھی ہو
مگر کسی نے بھرا دم نہ آشنائی کا
جو ہوشیار ہو کیوں رازداں کرے پیدا

(دشتِ شام۔ تلاش)

گھر سے باہر نکل کر دوسروں سے ملنے کا یہ اشتیاق تاریخ، فلسفہ اور شعر بن جاتا ہے۔ اہلِ دل کے بارے میں اس کا ارشاد ہے ؎

سچّے فن کار ہیں لختِ جگرِ موسیقی
وہ اگر ہیں تو فقط حُسن و صداقت کے غلام
شبِ تاریک کے سینے میں ہے سرِّ خورشید
اہلِ دل نوش کریں دُردِ تہِ جامِ حیات
فن کشودِ گرہِ دل ہے، گرفتاری ہے
ہم سمجھتے ہیں سخن سنج کو ایسا غوّاص
یم افکار سے لے کر موتی
دلِ خونابہ فشاں سے جیوتی
جو پروتا ہے شبِ تار میں سلکِ گوہر

(دشتِ شام۔ حقیقت و افسانہ)

اور یہ حُسن و صداقت کی ابدی اقدار کی پرستاری اور شبِ تار میں سلکِ گوہر پرونے کے علاوہ

بھی کچھ اور باتوں کا ادّعا و تقاضا ہے ؎

عشق کا زہر پیالہ پیو، سقراط صفت
سامنے دشتِ ابد پھیلا ہے تا حدِ نظر
کون ہے شمعِ صداقت کا جو پروانہ بنے
نارِ غم میں جلے ، گردِ رہِ جانانہ بنے
دِل پہ جو گزرے کہے کافر و دیوانہ بنے
زندگی نذرِ حقیقت کرے، افسانہ بنے

(دشتِ شام)

اِن اشعار میں اس کی شاعرانہ بلندی اور عظمتِ فکر پوری طرح نمایاں ہے۔ اس کا علم و اِدراک، ضبط و ایثار، شکوہ و شوق سب کچھ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس کا شاعرانہ مطمحِ نظر، اور فن کارانہ لائحہ عمل کسی مصلحت و مصالحت کے تابع نہیں۔ ان اشعار میں حُسن و صداقت اور محبت و حقیقت کی تلقین ہے۔ لیکن یہ فلسفۂ اخلاق عملیت اور مقصدیت کا حاصل ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ ہے اور نہ صرف یہ کہ انداز و اسلوب شاعرانہ ہے بلکہ صحیح شاعری بھی یہی ہے۔ زندگی کے وسیع ترین امکانات کو دشتِ ابد کی لامحدود اور بیکراں وسعتوں کے استعارہ میں پیش کرنا رمزیت اور ایمایت کی خوبی ہے اور ساتھ ہی انسانی ضمیر کی انتہائی جراُت مندی بھی۔ امکانات و ممکنات کی اسی خوشبوئے عفّت مآب کا سُراغ لگانے کے لئے ولایات و امصار و اقالیم و دیار کے ہر زائر و سیّاح سے ملنا جد و جہدِ انسانی کا ایک اور خوبصورت استعارہ ہے۔ ان اشعار میں روحانی خوش طبعی اور اخلاقی شیفتگی و شگفتگی ہے (میرؔ اور دردؔ کی غزلیں اسی روحانی کیف اور پاکیزگیٔ غم کی حامل ہیں) شعر و انشا کا مقصد محض بزم آرائی اور تفریحِ طبعِ دوستاں نہیں ہوا کرتا۔ شب ہائے رفتہ کا تذکرہ اعادۂ لذّت و آرزو کے لئے ہی نہیں کیا جاتا، بلکہ بجھتے ہوئے لمحوں کی راکھ میں صبحِ نو کی چنچل کرنوں کا اضطرار و اضطراب بھی دیکھ لیا جاتا ہے۔ خاکسترِ پروانہ مُردہ ہی سہی لیکن وہ دلوں کی خاموش بینائی کی زبان

بن جائے تو یہ شاعرانہ طریقِ نوا سنجی ہو گا۔ کہتا ہے ؎

نشاطیاں نہیں آگاہ ذوقِ ماتم سے
مقامِ دل میں مسافر ہیں منزل و جادہ
دوا پذیر نہیں دردِ آشنائی کا
ہے دُور باش کی آواز مُژدہ قربت کا
کہ مُدّعا ہے تغافل سے امتحانِ وفا
حقیقتوں کو رہینِ مجاز رکھتے ہیں
دلِ بشر کو ہمیشہ گداز رکھتے ہیں
فغانِ نیم شبی، نالۂ سحر گاہی
سرشکِ چشم و تفِ دل خروشِ یارب ہا
اِک آبگینہ ہے دل، ہجر کی چٹانوں پر
اِس آبگینے کو میں پاش پاش کرتا ہوں

(ورقِ ناخواندہ۔ گنجِ رنجِ رائگاں)

وہ آبگینہ کو پاش پاش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کے عقدۂ دُشوار کو حل کرنے کے لئے یہ مشورہ بھی دیتا ہے ؎

تھوڑا سا زہر بھی کبھی کھا لینا چاہیئے
ہوتے ہیں سینے اس کے اثر سے سہانے

(ورقِ ناخواندہ۔ گھُلائے رسوائی)

چنانچہ آپ نے دیکھا کہ وہ تلخ ترباتیں تلخ ترین لہجے میں کہتا ہے اور ایسی حالت میں لفظوں کی چاندنی اور خیالوں کی دھوپ، طلوعِ سحر کی شگفتگی اور شیوہ ہائے دلبری کا ذکر تک نہیں کرتا۔ سنگین حقائق کے لئے سیدھے، سچے اور اکل کھرے الفاظ کا انتخاب اس کی فنی بصیرت کا خوبصورت ثبوت ہے

یہی لہجہ اسے یہ خود اعتمادی عطا کرتا ہے اور وہ خود کو اور احباب کو یہ مژدہ سُناتا ہے ؎

مجھے یقیں ہے کبھی میرے سوزِ پنہاں کی
نہ بجھ سکے گی کرن صرصرِ حوادث سے

اور کیا یہ ایک سائنسی اور تمدّنی حقیقت نہیں کہ دُنیا بھر کے اندھیرے مل کر بھی ایک دیئے کی کانپتی ہوئی لَو پر فتح نہیں پا سکتے؟

متحمّا: ان کا قصیدہ میمیہ ہے۔ محسن کاکوروی علیہ الرحمۃ کے لامیہ کے بعد میمیہ ہی ہونا چاہیے تھا یہ ضروری نہیں کہ قصیدے بادشاہوں اور رئیسوں کی شان ہی میں ہوں۔ ہر چند کہ فارسی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ انہیں قصیدوں پر مشتمل ہے۔ اور ان قصائد میں تملّق، چاپلوسی، خوشامد اور غلو غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو نفس پرست امراء کو خوش کرنے کے لئے ہونا چاہیئے۔ لیکن قصائد صرف مدحیہ ہی نہیں بلکہ بہاریہ، وصفیہ، اخلاقی، صوفیانہ، مذہبیہ بھی ہیں۔ نعتیہ قصائد انہیں مذہبی قصائد کے تحت آتے ہیں اور حکیم سنائیؒ، سعدیؒ، قاآنیؒ، عرفیؒ اور انوری (ان دونوں کے نعتیہ قصائد) کے قصائد تو ایسے ہیں کہ ملائکہ اور اشباحِ طاہرہ و ارواحِ مقدسہ کی تسبیح و تہلیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں مسائلِ اخلاق بھی ہیں اور قوانینِ الٰہی کی تعلیم بھی۔ ان شعراء کی حکمت مآبی اور ان کے فن کی بلند پائیگی کا ان قصائد سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت آج ہمارے پاس نہیں۔ خالد کا "متحمّا" بھی ہماری عظیم ترین ادبی روایات کا حامل ہے اس قصیدے میں مذہب و شریعت، عرفان و توحید، نبوّت و منہاج نبوّت اور ذات قدسی صفات کے مکارم اخلاق و حُسنِ کردار کا تذکرہ ہے۔ مگر ان کی مشکل پسندی نے اس قصیدے کو محسن کاکوروی کے قصائد کی سی روانی، سلاست اور نشاط و سرمستی سے ہمکنار نہیں ہونے دیا۔ مجھے یہ اعتراض نہیں کہ اس میں سنسکرت یا ہندی یا عبرانی و سریانی زبانوں کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ ناچیز خود اسی روشنی کا سالک ہے۔ لیکن قوافی اس قدر مشکل اور ادق ہیں کہ ایک اچھا پڑھا لکھا شخص بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر قصیدے میں جس بہاریہ اور نشاطیہ فضا کا ہونا ضروری ہے وہ یہاں موجود نہیں۔ یہاں صحرا کا جاہ و جلال نہیں۔ البتہ سنگلاخوں کی سنگینی و سختی ضرور ہے۔ لیکن مُطالعِ آدم و انجم اور متاحِ لوح و قلم کا قصیدہ

لکھا جائے اور کلام دھوم دھام اور سج دھج سے معرّا رہے تو یہ بات عالمانہ تو ہوگی، شاعرانہ ہرگز ہرگز نہ کہلائے گی۔ قصیدے کی بحر الفاظ کی گراں باری سہار تو گئی ہے۔ لیکن اس کی حالت اُس خاتون کی سی ہوگئی ہے جس کے حُسن و رنگ کو کثرتِ اولاد نے مسخ کر دیا ہو۔ نامانوس الفاظ تشدید جزم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے الفاظ یوں نظر آتے ہیں جیسے مصری غلام کسی فرعون کے تازیانوں سے تڑپ تڑپ کر اہرام تعمیر کر رہے ہوں۔ حالانکہ موضوع کا تقاضا یہ تھا کہ الفاظ کا یہ تاج محل فکر و نغمہ کی پریاں، آزاد اور کھلی فضاؤں میں تعمیر کرتیں۔ لیکن پریوں کے برعکس یہ کوئی ایسا ہیکل معلوم ہوتا ہے جسے دیووں اور جنّوں نے بنایا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ "فارقلیط" ان عیوب سے پاک ہے۔ "فارقلیط" کا پہلا شعر پڑھتے ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ہمیں شہنشاہِ لولاکؐ مولائے سدرہ کا دیدار ہونے والا ہے۔ بدن پر ایک رعب اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے ؎

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے

میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے (فارقلیط)

اس میں کیا شک ہے کہ زمین ہمیشہ رحمتِ باری ہی سے فیض یاب ہوتی ہے۔ اگر سماوی برکات کا نزول رُک جائے تو دھرتی کی جلی ہوئی کوکھ سے ایک برگِ گیاہ تک نہ اُگ سکے۔ ہماری شاعری ارض و سما کے درمیان ایک پُل کا کام دیتی ہے۔ انبیاء ہمارے روحانی سفر کے رہنما اور دنیوی زندگی کے پیشوا ہوتے ہیں۔ شعراء روحانی اور دنیاوی زندگی کے نئے سے نئے تقاضوں اور روز بروز پیدا ہونے والی اُمنگوں اور اُمیدوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو وہ عظمتِ بشری اور حُسنِ ارضی کے گیت گاتے ہیں۔ میں یہاں مسخرگی اور پیشۂ نقالی کی بات نہیں کر رہا بلکہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمارا ذہن اسی سقفِ سما کا اشارہ اور ہمارا انچلا دھڑ اسی فرشِ زمین کی علامت ہے اور موجِ ہوا کے لئے انسوں کا مہمان ہمیشہ منتظر رہے گا۔ اس نعتیہ مگر انتہائی لطیف شاعرانہ رمزیہ انداز کے بعد شاعر اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے ؎

قلمبند ہو کلکِ دخامہ سے کیسے بیاں تیرے حُسنِ گلو ساز کا ہے

حُسنِ گلو ساز کی برق پاشیوں نے اردو شاعری کے تمام تر غنائیہ اشعار کی یاد تازہ کردی ہے۔ بات ہوئی نا! رواں دواں بحر، جوئے کہسار کی طرح اٹھلاتی، لہراتی، بل کھاتی، مسکراتی اور ہنستی کھیلتی ہوئی بحر، صحرائے عرب کی زندگی کی طرح سادہ اور دلنشیں۔ سادہ رخانِ نجد کی طرح زندہ و بیدار بحر، نجیب الطرفین لڑکوں، بالوں کی طرح خوبصورت اور شگفتہ ردو قافیے۔ تپتی ہوئی سنانوں اور نوکتی ہوئی کمانوں کی طرح لَو دیتے ہوئے مصرعے، حریمِ کبریا کے محراب و منبر کی طرح پیوستہ ٹکڑے، چھوٹے چھوٹے عربی جملے، فرانسیسی، انگریزی، ہندی، اردو اور بنگالی اور فارسی الفاظ، جیسے نیلم کی خاتم زرنگار کے اردگرد، یاقوت و زبرجد، موتی اور پنّے، ہیرے اور فیروزے جڑے ہوئے ہوں۔ کوئی ترکیب دور از کار نہیں۔ کوئی جملہ زمینِ ذوقِ سماعت پر سنگباری نہیں کرتا۔ کوئی لفظ نامانوس نہیں۔ لہجے میں حسینانِ ناکردہ کار کی سی اچپلاہٹ اور موتیے کے پھولوں کی خوشبو، شاعری کے اخلاقی ضابطوں کا احترام، ادبی اصولوں کی پابندی۔ وجدان و نشاط کے عالم میں بھی صوفیانہ ہوشمندی، اور ہذیان و جنون کے طریقِ کار کا اختلاف۔ غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو ایک مَلِک الکلام کے پاس ہونا چاہیے یہاں عقل و ہوش کی رہنمائی بھی ہے۔ عمل و فکر اور مقصد و غائت کی کارفرمائی بھی۔ لیکن زندگی اور کائنات کے خوشگوار اور ناخوشگوار پہلوؤں کی گرہ کشائی بھی۔ عظیم سچائیوں، مقدس شرافتوں، شاعرانہ عبادتوں اور فنکارانہ ریاضتوں کی حامل یہ نظم ملکی استحکام، قومی تعمیر، انسانی معاشرے کی برکتوں اور نیکیوں کا مظہر ہے۔ روح اور قلب کو ایک تازگی اور کشادگی ملتی ہے اور دکھی دلوں کی اذیتوں میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ آخری لوح میں ملّتِ بیضا کے سینے پر جو زخم اور جو رِستے ہوئے ناسور ہیں، ان کی نمائش نہیں بلکہ ان پر نوحہ خوانی کی گئی ہے۔ یہ ہمارے ادب میں ایک مقدس اور صالح روایت کا بھرپور آغاز ہے۔ ان کے مذہبی عقائد سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے، اور مجھے ہے۔ لیکن ذاتی تعصبات کی آڑ میں اس عظیم الشان WORK میں نقص ڈھونڈنا الم خیزی اور اذیت نوازی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔ "فارقلیط" خالد کی زبونیٔ ہمت یا ترعرق انفعال کا نتیجہ نہیں، یہ تو ہوائے شوق میں اڑنے اور آسمانی رفعتوں پر علمِ تقدیس و حرمت لہرانے کا ولولہ ہے۔ یہاں طنطنہ، سطوت و

رعبِ تعمیر نہیں بلکہ اس نظمیہ کی فضا کچھ ایسی ہے جیسے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مدینے پہنچے ہیں، لوگ جمع ہو رہے ہیں، دوشیزگانِ بنی نجار نغمہ سرا ہیں اور مسجد قبا تعمیر کرنے کا ڈول ڈالا جا رہا ہے۔ اس نظم میں کوئی آن بان اور کوئی ذوقِ آرائش و زیبائش نہیں اور یوں یہ حضور سرور لولاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خندہ روئی، شگفتہ مزاجی، سفید پوشی اور غریبانہ خودداری کا مظہر اور پیکر بن گئی ہے۔ یہاں نہ تو کسی متخالف پس منظر سے وحدت پیدا کی گئی ہے۔ نہ ہی بہاریہ اور نشاطیہ منظر سے حُسن پیدا کیا گیا ہے۔ نہ ہی تجانس و تشابہ کی کارگیری دکھائی گئی ہے نہ ہی اس میں وصل و وداعِ محبوب کی کیفیتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن نظم ہے کہ حضورِ پاکؐ کی حیاتِ طیبہ، اُن کے گندمی رنگ، اُن کی کیفیت آواز اور ان کے دلنشیں اندازِ تکلّم کی علامت بن گئی ہے نظم کی بحر اپنے موضوع سے جس طرح ہم آہنگ ہے اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے وہی عرب کا رنگ روپ، وہی صحابہ کی صورت و شکل، وہی مدینے کی گلیوں کی سجاوٹ اور نکھار، غرضیکہ اس بحر میں ہر وہ دلکشی اور ہر وہ عصمت و پاکیزگی اور نغمگی و رعنائی ہے جو پیمبر صحرا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ایسے اہم موضوع کے لئے ہونا لابدی اور ضروری ہے۔

الفاظ کے سلسلے میں خالدؔ نے جس ہُنرمندی اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے وہ ایک علیحدہ مقالہ کا مطالبہ کرتا ہے یہ مختصر سا مضمون ہر چند کہ اس پہلو کی اچھی طرح تشریح تو نہیں کر سکے گا لیکن میں اتنا ضرور عرض کرنا چاہوں کہ اس نے ہندی اور اردو الفاظ سے یعنی اسماء اور مصادر سے بہت سے نئے اسمِ توصیفی وغیرہ بنائے ہیں اور اس کے تمام الفاظ ہماری معاشرت، ہماری تہذیب اور ہماری تاریخ کے مختلف ادوار کی خصوصیات کے حامل ہیں

کہا ابرہہ سے مرے اونٹ لوٹا

کہ دل کو غم و غصہ اونٹا رہا ہے

اونٹ کے غصے کو اصطلاح میں شُتر کینہ کہا جاتا ہے۔ ذہن میں رکھ کر لفظ "اونٹا" کی صوری اور معنوی شکلوں کو دیکھیے اور اس لفظ کی داد دیجئے۔ اسی طرح للا۔ اُٹّمنا، گندمیں اور گہراؤ ہیں۔ گہرائی کے لئے گہراؤ یقیناً حسین اور گمبھیر لفظ ہے۔ گہراؤ کی آخری آواز "و" واؤ ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے، کہ

جوفِ بحر سے یہ آواز پیدا ہو رہی ہے۔ NECTAR کے لئے نکتار ایک اور عمدہ ترجمہ ہے۔ کیفی پنڈت دتاتریہ کے تخلص کے علاوہ اردو میں ان معنوں میں شاید ہی کسی اور شاعر نے استعمال کیا ہو۔ ریگھاروں اور سجدار دو ایسے لفظ ہیں جو فارسی اور ہندی کے میل تال سے بنائے گئے ہیں اور۔ یہ قابلِ قبول ہیں۔ خلفائے بنی عباس کے عہد میں عربی اور فارسی کے الفاظ میں پیوند، واؤ عاطفہ اور کسرۂ اضافت کی مدد سے یہ کوششیں کی گئیں کہ ہر دو زبانوں کو قریب تر کر دیا جائے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس امر میں خلفائے بغداد کو نمایاں کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ ہندوستانی مغل فرماں رواؤں نے ہندو خواتین سے شادیاں تو رچالیں لیکن زبان کے اس افادی پہلو پر چنداں توجہ نہیں کی۔ آج کوئی جنم زار مابدار لکھ دے تو ٹکسال باہر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ میل تال اور خلوص و یگانگت کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایسی کوششوں کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ مومن عربی کا لفظ ہے۔ سنسکرت اور ہندی میں یہ عام قاعدہ ہے کہ مصدر یا اسم کے ماقبل الف نافیہ لگا کر منفی معانی پیدا کر لئے جاتے ہیں۔ جیسے کل سے اکل، آکلی۔ سکت سے آسکت۔ بوجھ سے ابوجھ۔ یا پاپ سے اپاپ۔ اسی طرح خالد نے "مومن" سے "اومن" بنا کر اپنی زبان دانی اور جرأتِ شاعرانہ کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح "عطش" کے ساتھ ناک کا لاحقہ لگا کر "آتشناک" کی طرح یا "غضب ناک" کی طرح ہمیں ایک نیا لفظ "عطشناک" دیا ہے۔ کہیں یائے اضافی یا توصیفی لگا کر نئے اسماء وغیرہ بنائے ہیں۔ مثلاً "کولڑے" اور "سراغی"، ماندہ فارسی لفظ ہے۔ اسی کی جمع فارسی میں "گاں" کے لاحقے سے بنائی جاتی ہے۔ یعنی ماندگان۔ پسماندگان وغیرہ۔

ماندن مصدر سے "ماندے" کا لفظ بغیر "تھکے" کے استعمال کرنا ایک نئے لفظ کی تخلیق ہے۔ "تھکے ماندے" تو ہر کوئی لکھتا ہے۔ لیکن "ماندے" جو تابع مہمل نظر آرہا تھا اب خود ایک نئی حیثیت کا مالک نظر آرہا ہے۔ اسی طرح شہنائی کی جمع چھاؤں، گاؤں کی طرح شہناؤں۔ یہ صرف ایک لفظ کی تخلیق نہیں بلکہ ایک نئے قافیئے کا ایجاد ہے۔ اسی طرح "مردود" کی تانیث "مردودہ" ایک جدید لفظ، اور خالص خالدانہ نقد و نظر کا حامل ہے۔ "ظل" کا استعمال بغیر ترکیب کے نظر سے نہیں گزرا۔ ظلِ الٰہی اور

ظلِ ہُما تو پڑھے ہیں۔ لیکن ظلّ کو بغیر ترکیب کے زوردار دلالتوں اور معنوی وسعتوں کا حامل بنا دینا ان کی تخلیق کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔ ملکیّت کے لیے ہلک، ادھلی کے لیے "ادھلی"، پاؤں کے پنجے کے لیے "پب" اور پیچ در پیچ راہ کے لیے "پیٹیلی" یا نازک مزاج نگارانِ صحرا کے لیے "نازو"۔ یہ سارے خالد کے لسانی تجربے نہیں بلکہ ہماری زبان میں اضافے ہیں۔ یہ لفظ نحوی قاعدول کی رو سے کیسے بھی کیوں نہ ہوں، سرائیکی اور پنجابی زبان میں ان کا رواج عام ہے۔ چنگا، بوکھلا کا تابع مہمل چلا آتا ہے اب خود نئے معنوں کا حامل بن کر ایک جداگانہ اسلوب اور اظہار کا نمونہ بن گیا ہے۔ مقرر تیقّن کے لیے کم و بیش سو سال کے بعد خالد کے یہاں پھر استعمال ہوا ہے۔

ایک ترکیب ہے "منجھیلی راتیں"۔ بھینس کو پنجابی میں "منجھ" کہتے ہیں۔ چنانچہ بھینس کی رنگت اور جسامت کو نگاہ میں رکھ کر یہ اسم توصیفی گہری بوجھل اور سیاہ رات کے لیے تراشا گیا ہے۔ پھر منجھیلی میں نغمگی اور صوتی حسن ہے۔ اسی طرح ہنگار ابھرنا اور چپ ہو جاؤ کے لیے "بندرہو" یقیناً نئے الفاظ کا ایجاد ہے۔ "ایلیں کرنا" اور "کھمب" وغیرہ۔ اس کے الفاظ مہذب اور شائستہ ہیں۔ جگ بندھو، الجھیڑے، ہنینی رس، مانیا، کجرالے، اڑیو (خطاب کے لیے) یا ڈھول (محبوب کے لیے)

ان میں سطوت بھی ہے حشمت بھی تجمّل بھی ہے
ان میں عشرت بھی ہے لذّت بھی تموّل بھی ہے
بے زباں لفظوں میں پوشیدہ نعیمِ دوراں

(زرداغ دل۔ فریبِ ہستی)

شوقی، جدالی اور زار سے زارینہ، کھوج لگانا سے صیغہ امر کھوجو۔ گگن کھیلتی موج نسیم۔ واہ واہ۔ تشریح نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں اپنے لطف میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتا مصرعے یہ ہیں:۔

یہ گگن کھیلتی سرشار و جواں موجِ نسیم — ہر بُن مو سے اُمڈتا ہوا سیلابِ شمیم

(زرداغ دل۔ بازارِ حیات)

ششدرہ۔ شش در سے نہیں بلکہ شش دانگ عالم کے لیے شش کے ساتھ درہ کے لاحقے سے

وجود میں آیا ہے۔ اشتقلا ادردو میں اُشتغلا۔ اٹھانا متعدی، اٹھانا لازم۔ اشغلا چھوڑنا۔ شرارت کی بات کرنا۔ پُرنار، برائے عورت) بُستانی اسم صفت ہے۔ ان کے یہاں اسمِ فاعل کے معنوں میں استعمال ہو کر ایک علیٰحدہ لفظ بن گیا ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ اس نے تراکیب کی ساخت میں بھی اپنے علم و فضل، اپنے حواس خمسہ، اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور رجحاناتِ جنسی سے صحت مندانہ طور پر کام لیا ہے۔ یہ تراکیب مدہوش کن، نشہ آور، شراب و شہوات و شباب سے پُر ہیں۔ یہ خوبصورت زرنگار اور جگمگاتے ہوئے آبگینے رہزنِ تمکین و ہوش بھی ہیں اور مصدرِ ولولہ و جوش بھی۔ ان ترکیبوں کا ایک سمندر ہے جو اس کے ہر دیوان میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ انتخاب بے حد مشکل ہے لیکن چند ترکیبیں لکھتا ہوں :-

شبِ فرخندہ نفس، زنِ ویراں، بنزانِ گلابی پوشاک، عشرتکدۂ نیم شبی، کوفتۂ طولِ امل، پلنگ زرپوش، شاہدِ بے کابیں، یار ہم خوابہ، آشفتہ سودا، لاف و لاغ، شوقِ تاج و تاراخت، ربِ جمال، ربابِ الجمال، ہمائے آگہی، ورق نگارِ خیالات، نقش بندِ ضمیر، مقدماتِ تمنّا، گوش نیوشا، آرزوئے رنگیں، ساقیِ نجم نگہ، سنگِ کریم، مرتہنِ زار و بوم، دائمیِ شہوات، بحرِ خلود، ناسفتہ جوانی، عشرتکدۂ تصدیعات، طرحداریِ ریحانِ شباب، خمِ نابِ شباب، آشوبِ استخواں، شہیدانِ خیالات و بیاباں، ناسفتگانِ گردوں، سلسبیلِ سکوت، لطائفِ لاہوت، افسونِ نوشِ خنداں، نکہتِ نو دمیدہ، خونِ رگِ صاعقات، کفِ گوہر فشاں، تیشۂ آفاتِ جہاں، دودۂ آذر نفساں، فسونِ ہمیشگیِ نُعیت، زمزمۂ سوزناک، جریدہ ہائے ہُنر، بتِ شگرف ماجرا، تسبیحِ زندگانی، زفاف گاہِ تمنّا، اور خانقاہِ وصال، اور نہ جانے ایسی کتنی ترکیبیں اس کے ہر دیوان کے ہر صفحے پر بکھری پڑی ہیں۔ منظر نگاری، آہنگِ نغمہ، تشبیہات اور زورِ بیان بیانیہ شاعری کی بنیادی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ فقیر نے لکھا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی VOWEL TECHNIQUE ایک نئی تکنیک ہے۔ گو اس میں اس کے اور ہمعصر بھی شامل ہیں۔ پھر بھی اس کے یہاں آہنگ و ترنم کی اور منظر نگاری کی صنعت کاری بے حد دلفریب ہے۔ البتہ کہیں کہیں دسکین اوسط اور شکستِ ناروا کو چھوڑ کر۔

محض نامانوس اور اجنبی الفاظ کی وجہ سے آدمی پڑھتے پڑھتے کچھ ہچکچانے لگتا ہے۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ART IS FOR THE ARISTOCRATS" یعنی فن کا دائرہ محدود ہوا کرتا ہے۔ یہ بے شک صحیح ہے۔ لیکن ایسے الفاظ جو پتھر کا گولہ بن کر حلق میں اٹک جائیں۔ اگر نہ ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ بہرحال اب ان کی منظر نگاری کا فن ملاحظہ فرمائیں اور ان کی ہنرمندی کی داد دیں۔

نیلگوں بحرِ شفق پوش کی پہنائی میں
چھلکی مینائے سحر، کشتیٔ مہ ڈوب گئی
کہکشاں ماند ہوئی، قرمزیں موجیں اُبھریں
رات بھر ذہن میں افکارِ پریشاں کا ہجوم
کسی آئندہ مصیبت کی خبر دیتا تھا
مطلعِ نُور سے اُبھرتے ہوئے خمدار خطوط
آج شاید نئے طوفان کا مژدہ لائیں

(حریرِ رگِ گل۔ دکانِ شیشہ گر)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ افکارِ پریشاں کے ہجوم کو ظاہر کرنے کے لئے کس طرح نمودِ شب کا اہتمام کیا گیا ہے، ہر مِس کے لئے فضا تیار کی جا رہی ہے۔

اپنے مینار کے مانند خموش و تنہا
سرد مضبوط چٹانوں کی صلابت کی طرح
کافرانہ متمکّن ہے یہ مردِ بے باک
جس کو اب حق کی مہابت ہی ہلا سکتی ہے
بطنِ ایتھر سے گزرتا ہوا مانندِ سناں
میں سوئے چرخ بریں بال فشاں جاتا ہوں
اے خوشا عیدِ تماشا! نہ ہے طغیانِ نشاط

یہ طراوتِ گُل و غنچہ کی یہ امواجِ نسیم
یہ خلا تاب و سبک سیر شعاعِ خورشید
میرے ہی زیرِ تصرّف ہے یہ اقلیمِ فضا
جس جگہ آٹھ پہر گرمِ سفر رہتا ہوں

(حریرِ رگِ گُل ۔ دکانِ شیشہ گر)

بینار، مردِ مضبوط چٹانیں اور ان پر طوق و سلاسل میں جکڑا ہوا اک مردِ افلاک شکن یہ وجاہت حق سے ٹکرا گیا ہے۔ اس سارے پس منظر کے ساتھ جس طرح پیکِ ربانی کے لئے فضائے اثیر تیار کی گئی ہے۔ وہ منظر و پس منظر کا خوبصورت مرقّع ہے۔

اگر آپ اپنے میں رہ سکیں تو یہ سطریں بھی پڑھ لیں :۔

وہ گُلبدن جنہیں زیبا ہے ارغوانی پوشی
وہ سحرِ فن جو سکھاتی ہیں خود فراموشی
غزال چشم و فسوں ماجرا و بوقلموں
تمام سازش و ترغیب و التہاب و جنوں
مغنّیانِ جواں ، شاہدانِ سیمیں ساق
ہمہ وصال ہمہ لذّت ہم آغوشی
مہک سنہرے بدن میں گلاب و نسرین کی!

(ورقِ ناخواندہ ۔ دشتِ تمنّا)

خدا نہ کرے کہ آپ کو ایسے مناظر ان کے کلام میں پڑھنے کا موقع ملے۔ شبستانِ شہریاری ہو یا کسی غریب کی چار دیواری حسن و شباب کے مناظر اسی چمک دمک اور شوق و شہوت سے لبریز نظر آئیں گے۔ یہ کوئی صوفیانہ جنس زدگی یا جنسی تصوّف نہیں، بلکہ جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ آپ اسے سراپا نگاری بھی کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے منظر نگاری ہی کہنے دیجئے "سلومی" اس منظر نگاری کا اعجاز

ہے۔ مگر اس پر آسکر وائیلڈ کی گہری چھاپ ہے۔ "برگِ خزاں" سے یہ لائنیں دیکھئے :۔

قرصِ خورشید جہاں تاب شفق پوش ہوئی

ملگجی شام چھپی پردۂ زنگاری میں

سائے پھیلے در و دیوار پہ گندھک ایسے

کوچے ویران ہوئے قصر د نشیمن آباد

اخترِ شام کی سرمستی و رعنائی سے

آخر الامر کھلا عقدۂ ما لاینحل

پھر نہ اُبھرے گا یہ خورشیدِ جہاں تاب کبھی

اور اُبھرا تو اس ایوان کی بربادی پر

نوحہ گر نالہ چکاں مرثیہ خواں اُبھرے گا

آلِ نمرود کا ہنگامِ رحیل آپہنچا!

(آشور بنی پال)

اس کا آہنگ و رنگ اور اس کا زورِ بیان تمثیلی اور ترتیبی نظموں میں خوب نمایاں ہوتا ہے۔ ایک تو ان نظموں کے موضوع بڑے ارفع وجلیل ہیں۔ کارگاہِ حیات، فریبِ ہستی، فکرِ رائیگاں، حسرت و حرماں، کربِ تخلیق، ایثار و شہادت اور مذاقِ تفحصِ اشیاء ایسے عنوان ہیں جو ان صنمیاتی اور اسلامی تلمیحات کے معنوی حسن وجمال کے حامل ہیں۔ موقع و محل اور حالات و واقعات کے مطابق کرداروں کی گفتگو، لب و لہجہ اور لڑل دھڑک قابلِ دید ہے ؎

وادیو! اپنے کناروں میں چھپالو مجھ کو

ندیو! چادرِ سیلاب اُڑھادو مجھ کو

کوہسارو ـــــــ شق ہو!

(زلکنانہ۔ برگِ خزاں)

خیمۂ خواب سے اے قرمن جہانتاب نکل
نکل اور کلبۂ احزاں کو فروزاں کر دے

(فلکناز۔ برگِ خزاں)

اے زواں قطرۂ باراں بن کر
قعرِ دریا میں کہیں گم ہو جا
تیرہ آغوشِ صدف میں کھو جا

(فلکناز۔ برگِ خزاں)

بادشاہ سے طرزِ خطاب کا جلال و احترام دیکھیئے۔ بابل و نینوا کی تہذیب و شان و شوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہے ؎

آسماں تخت و اسد بخت و فلک بارگھا
کہکشاں سیر و پرن صید و ثریّا جاہا!

(برگِ خزاں۔ آشور بنی پال)

بارگھا اور جاہا کا اُبھرتا ہوا الف آشور بنی پال کی عظمتوں کا عَلَم بن کر فصیلِ افلاک پہ لہرا رہا ہے۔ ضحاک بادشہ کا مخلص سپہ سالار ہے، وہ پانی سر سے گزرتا ہوا دیکھ کر بادشہ کو خالص سپاہیانہ آواز میں جھنجھوڑتا ہے۔ اس کے الفاظ کی گھن گرج، اس کی ہمّت اور باطنی کرب کی بلا انگیزی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا کھرّا لہجہ اُس کی دیانت و استقامت کی تلوار بن جاتا ہے۔

حدِّ آداب! ابھی فکرِ زباں باقی ہے؟
ظلم، آداب کی دیوار کو ڈھاتا ہوا ظلم
موت کے راگ نفیری پہ بجاتا ہوا ظلم
صرصرِ قہر سے ہر نخل ہے نخلِ ماتم
کون سنتا ہے ترے دَور میں افسانۂ غم

تِری سفّاک ستم گار بہیمیّت نے
کاخ و کاشانہ میں کہرام مچا رکھا ہے
چار سُو گونجتی ہے ایک فغانِ پُر درد
قحط و سیلاب ہے ویرانی و بربادی ہے
زندگی آج تِرے ظلم کی فریادی ہے

(برگِ خزاں ۔ آشور بنی پال)

سُو نتو تلواریں اُٹھو دوڑو فصیلوں کی طرف

(برگِ خزاں ۔ آشور بنی پال)

اِس مصرعے میں حرکت، تیزی اور سُرعت قابلِ داد ہے ۔ یہ MOVEMENT اس کے بے شمار اشعار پر جلوہ گر ہے ۔

تشبیہہ و استعارہ آج سے نہیں بلکہ جب سے شاعری کی تاریخ شروع ہوئی ہے ۔ اہلِ کلام کے نزدیک مقبول ترین پیمانۂ اظہار و ابلاغ رہے ہیں ۔ محسوس کی جانے والی چیزوں کی مصوّری ، اور نامحسوس کیفیتوں کی صُورت سازی تشبیہہ کے بغیر ناممکن ہے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تشبیہات میں دلکشی توانائی اور تازگی اور قاری کی بصری قوّتوں سے قربت پائی جائے ۔ اگر تشبیہات میں جدّت ، نُدرت اور دلآویزی و رعنائی نہ ہوگی تو کلام بے لطف ہو جائے گا ۔ تشبیہہ کی دو قسمیں ہیں مفرد اور مرکّب دانانِ رموزِ فن کا ارشاد یہ ہے کہ مفرد تشبیہہ میں جدّت نہیں ہوسکتی ۔ کیونکہ ہر شخص انہیں بہت جلد محسوس کر لیتا ہے ۔ اور پھر شعرا اور اہلِ قلم حضرات ایک مدّت سے تشبیہہ مفرد کو کام میں لا رہے ہیں ۔ یہ عجیب دلیل ہے ۔ اگر شعرا اک چیز کو ایک مدّت سے کام میں لا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی دلکشی تو ہوگی ۔ مومن کا یہ مصرع کس سخن فہم نے نہیں سنا اور وہ کون سخن فہم ہے جو سُن کر تڑپ نہیں اُٹھا ؂ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو !

اسی طرح کی مفرد تشبیہات خالد کے یہاں ہیں اور ڈھیروں ہیں۔ خیال افروز تشبیہیں۔ جو حقیقت نگاری، صداقت، مشابہت اور بنیادی واقعیت کی خوبصورت تصویریں ہیں۔

کیفیت چہرے کی وہ جیسے کلی سوسن کی
عکس انداز کسی نقرئی آئینے میں (سلومی)

نقرئی آئینے اور روئے نگار میں جو نسبت ہے۔ ظاہر ہے پھر سوسن کی کلی کی عکس اندوزی جس طرح چہرے کی کیفیت کو ظاہر کر رہی ہے وہ تازگی اور جدّت سے خالی نہیں۔

شراب کی تعریف میں ؎

قرمزی جیسے قبا قیصر کی (سلومی)

قرمزی تو قبا کا رنگ ہوا۔ لیکن قیصر کہہ کر شراب کی تندی، تلخ کلامی اور ہلاکت آفرینی کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ پھر قرمزی رنگ خود خون کا رنگ ہے۔ ایک اور تشبیہہ دیکھیئے۔ ہماری عملی زندگی کا یہ مطالعہ کتنا خوبصورت اور ہمارے مشرقی مزاج کا کتنا عمدہ مشاہدہ ہے ؎

دل مرا دودھ چھڑائے ہوئے بچے کی طرح،
رقت ہے آہ و فغاں کا گھڑی واویلے کی (سلومی)

یہ صرف آہ و فغاں اور واویلے ہی کا اظہار نہیں، بلکہ دودھ چھڑائے ہوئے بچے سے دل کی تشبیہہ پاکیزگی اور معصومیت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ یہ آرزوؤں کا پاکیزہ واویلا ایک مومنی کا حال ہے۔

موسمِ شباب کے بارے میں آپ نے نہایت ہی خوبصورت تشبیہات پڑھی ہوں گی لیکن یہ تشبیہہ آپ نے کہیں نہ دیکھی ہوگی ؎

ہے مادہ گورخر کی طرح موسمِ شباب
بو سونگھتی ہے باؤ کو شہوت کے جوش میں (ورقِ ناخواندہ)

حواسِ خمسہ پر یہ تشبیہہ بجلی بن کر گرتی ہے۔ پھر زندگی کا مطالعہ کس قدر قریب سے کیا گیا ہے۔ ہمارے ادب اور ہماری زبان پر جنگل کا بہت زیادہ احسان اور اثر ہے۔ بے شمار الفاظ، محاورات اور

مقولے آپ کو جنگل کی عطا نظر آئیں گے۔ لہٰذا اگر خالد کے یہاں ایسی تشبیہات ہیں تو وہ غیر فطری نہیں۔ انوکھی یوں ہیں کہ انہیں خالد کی طرح اور کسی نے نہیں دیکھا ؎

شاہزادی نے چھپا رکھا ہے مُنہ پنکھے سے
سیمگوں ہاتھ پھڑکتے ہیں کچھ اس شدت سے
قمریاں جیسے ہوں بے تاب نشیمن کے لئے
چھاتیاں ہلتی ہیں پر تولتے پنچھی کی طرح (سلومی)

آپ نے اس کی اقلیمِ سخن میں تشبیہات کے ان نادیدہ و نایافتہ سمن زاروں کا حُسن دیکھا؟

دل کی چالاک ہے، مُنہ اس کا ملائی ہوئی مے
(سلومی)

آرزو اِک زنِ محتالہ و مکّارہ ہے
(سلومی)

جَل سے لبریز ہے بادل کہ بدن مستی سے
(سلومی)

آتشِ تر کی طرح جلتے ہیں بھیگے ہوئے مُنہ
(سلومی)

کفِ دریا ہے تازہ دودھ کا جھاگ
(کفِ دریا)

زخم تیرا ہے سمندر سے بڑا
(سلومی)

اُس کی تمثیلوں میں تشبیہات و استعارات، اشارات و کنایات اور مظاہرِ خارجیہ کی جھلکیوں سے جس طرح ڈرامائی فضا پیدا کی گئی ہے، وہ منظوم تمثیلوں میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ سلومی میں

خوف و دہشت اور کرب و اضطراب کی فضا جس طرح چاند کی زردی اور مُردہ عورت کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں کی سردی سے پیدا کی گئی وہ لائقِ تحسین ہے۔ اسی طرح آنے والے حادثات کا عکس پرندوں کی پھڑپھڑاہٹوں یا دُور کسی اُبھرتے ہوئے سیلاب کی شور انگیز آہٹوں میں دیکھ لینا اور قاری کو تخیر، غم اور حزن و یاس کی فضا میں بیک جُنبشِ قلم پہنچا دینا انتہائی ڈرامائی ندرتوں کی حامل SITUATIONS ہیں۔ حیات و موت کے وہ اسرار جو رگِ جاں میں نشتر بن کر چبھتے اور کھٹکتے ہیں موہوم ہیولوں اور دُھندلاہٹوں کا رُوپ دھار کر دل پر ایک ہیبت سی طاری کر دیتی ہیں۔ فضا اور ماحول کی تخلیق میں اسے بڑی قدرت حاصل ہے۔ شاعری تو ایک طرف رہی وہ تو ان تمثیلوں کے عنوان ایسے قائم کرتا ہے کہ سارا ماحول اور سارے کردار جیتے جاگتے نظر آنے لگتے ہیں۔ غیور و جسور اور صبر و عزیمت اور حلم و برداشت کے پیکر، ہوس، غضب اور شہوت و شراب کے نشے میں بدمست انسان، بزدلانہ مصالحت سے نفور اور عزم و ثبات کے نمائندہ افراد، طلوعِ سحر کی خوشنما امیدوں کی طرح دلوں کی ڈھارس بندھاتی ہوئی خوبصورت عورتیں خلوص و ایثار، اور عصمت و عفت کی دولتِ گُم گشتہ کو مر کر پا لینے والی آبرو باختہ محبوبائیں، جامۂ فقر و قناعت اور قبائے صبر و عبادت میں چھپے ہوئے گرگانِ تشنہ خوں، مکار زاہد، جالئے راہب، سازشی اور فریبی پیرانِ کنشت و کلیسا، غرضیکہ یہ تمام کردار اپنے خصائلِ عالیہ اور عاداتِ ذمیمہ کے ساتھ اس کے ڈراموں میں اُبھرے ہیں۔ یہ تمام کردار GRAND تو ہیں، مگر GROTESQUE نہیں۔ ان تماثیل کی شاعری صحیح معنوں میں HUMAN ART ہے۔ گوہرِ ہر سود کو جیبِ زیاں میں ڈال کر "بازارِ حیات" میں متاعِ درد کو پھینک کر انسانی فطرت کا یوں مطالعہ کرنا اور اس جرأت سے نتائج مرتب کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لئے ایک عمر کی خلوت اور ریاضت درکار ہوتی ہے ؎

قرن ہا باید کہ تا یک کودکے از لطفِ طبع
عاقلِ کامل شود یا فاضلے صاحب سخن

حق جوئی، حق گوئی، رضائے دوست یا ہوائے خویشتن کو اپنا لینا، یا پا لینا ہمایوں نہاد طبع وقار کا کام

ہوا کرتا ہے۔ سخن سنجی اور خوش خیالی، ہذیان سرائی اور نفسیاتی ژاژ خائی سے بہت مختلف چیزیں ہیں۔
صبح صادق کے انوار میں کعبۂ جاں اور محرمانِ حرم کی طرح حسنِ کعبہ کو عریاں دیکھ لینا ہر شب رو کا مقدر نہیں ہوا کرتا۔ لباسِ ہوس میں بوئے عفت اور رنگِ شفق میں سُرخیِ خونِ شہیداں کے جلوے پا لینا ہر چشمِ تماشائی کے حلقۂ دسترس میں نہیں ہوا کرتا۔ مرکبِ شوق کو وادیٔ فکر و تخیل میں ہی نہیں بلکہ عرصہ گاہِ جنگ کو جہاد اور میدانِ مرگ و شہادت میں بھی جولاں کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ باتیں حضراتِ حقائق آشنا اور صداقت دستگاہ سے چھپی ہوئی نہیں۔

جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں خیل در خیل، موج در موج اور جہاں در جہاں لے کراں ہیولے، پرچھائیں اور افکار اُبھرنے لگتے ہیں۔ پھر یہ سائے، یہ ہیولے اور یہ افکار الفاظ بن کر ایک وجود اختیار کر لیتے ہیں۔ ہم اپنے تصوّرات، مشاہدے اور احساس و تجربہ کے تحت ان الفاظ کی خانہ بندی کر لیتے اور ان کے ساتھ مخصوص معانی وابستہ کر لیتے ہیں۔ پھر یہ الفاظ اور معانی بھی ایک مقام پر پہنچ کر اپنا وجود کھو دیتے ہیں اور شخصیات و مقامات یا واقعات و آثار کا جسم اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم صرف کسی مقام یا کسی شخصِ واحد کا نام لیتے ہیں تو ان اسماء و آثار کی تمام معنوی دلالتیں، ان کے فنّی تلازمے اور ان کی خصوصیات ہمارے ذہن میں بیک وقت کوند جاتی ہیں۔ مثلاً آدم، معمارِ جہانِ نو، ہابیل، اوّلین کشتۂ راہِ خدا، قابیل، نفسِ امّارہ کی دنایت۔ نوح طوفان و تادیب۔ ابراہیم، نارِ نمرود، راہِ حق میں استقامت۔ تعمیرِ حرم۔ اسمٰعیل۔ اطاعت و طلبِ رضائے الٰہی۔ رام۔ رضائے پدری کے لئے تخت و تاج کو ٹھکرا دینا۔ سیتا۔ شوہر پرستی۔ بدھ، تلاشِ حق میں سلطنت کو ٹھکرا دینا۔ سقراط، اپنے عقائد میں پختہ ہونے کے لئے جامِ زہر پی لینا۔ موسیٰؑ اور عیسےٰؑ، عظمتِ فراعنہ اور شوکتِ کیاسرہ و روم پر بے سرو ساماں انسانوں کا خندہ زن ہونا، اور کفر و ضلالت کی قوتوں کو خاک میں ملا دینا۔ حضور رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک یتیم بچے کا ہادیٔ اُمم بن جانا۔ صدیقؓ، فاروقؓ، غنیؓ، علیؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ اور حسینؓ وغیرہ محض الفاظ نہیں رہے، بلکہ یہاں لفظوں نے انسانی وجود کی شکل و صورت اور گوشت پوست اختیار کر لیا ہے۔ یہ شخصیات الفاظ کے معانی وجود ہیں۔ اسی طرح مقامات و واقعات ہیں

تاریخی، تمدّنی، تہذیبی، مذہبی اور ہمارے ثقافتی رجحانات کی تاریخ بن گئے ہیں۔ عکاظ، ذوالمجاز، کوفہ، مروہ و صفا، بازارِ مصر، حواریانِ عیسٰی، چاہِ نخشب، حُسنِ یوسف، بابل و نینوا، دریائے فرات، دریائے نیل، دریائے دجلہ، دشتِ کربلا، تیشۂ فرہاد، صحرائے مجنوں، نہرِ شیریں، محملِ لیلے، آپ نے دیکھا کہ سارے لفظ بظاہر نہایت معمولی ہیں۔ لیکن ان میں صدیوں کی تاریخ، زمانِ رفتہ کے واقعات رستہ خیزیٔ کفر و دیں، شورش دبائے ہوئے عاشقانہ اور فقر و دابِ سلاطین کی داستانیں سموئی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم اسی قبیل کا کوئی لفظ یا ترکیب استعمال کرتے ہیں تو کتنے تہذیبی سلسلے، نسلِ انسانی کی ارتقائی منزلیں، اخلاق و مکارم الہیہ کی حسین و جمیل صورتیں اور معاشرے کی حالتیں اور کیفیتیں اپنی تمام تر خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں خالدؔ کا کلام ان تلمیحات کا گنجینہ اور خزینہ ہے۔ انگریزی، عربی، سریانی، لاطینی، جرمنی، فرانسیسی، ہندی اور پنجابی واقعات و شخصیات کی یہ تلمیحات نہایت ایمان افروز اور خیال آفریں اسلوب میں نظم ہوئی ہیں۔ یہ صرف زیبِ داستان اور حُسنِ بیان کے لئے نہیں لائی گئیں بلکہ ان میں ارض و سما کے دلوں کی دھڑکنیں گونجتی ہوئی سُنائی دیتی ہیں تلک الایام ند اولھابین النّاس کی تفسیر ان تلمیحات سے بڑھ کر اور کسی پیرائے میں اس قدر توجہ طلب قطعاً ثابت نہیں ہو سکتی (میں یہ فقرہ تفاسیر و تراجم، اور دیوان ہائے شرح آرزو کو سامنے رکھ کر لکھ رہا ہوں) پھر ان تلمیحات سے جو خالدؔ کے کلام میں بکثرت اور برمحل پائی جاتی ہے۔ اس کی اخلاقی برتری، ذہنی شرافت، قلبی وسعت اور انسانی سرشت کی عظمت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

غزل اور تغزّل پر اس قدر لکھا گیا ہے کہ اب اس موضوع پر ایک میرے ایسے رتاع کا کچھ لکھنا کچھ عجیب سا ہوگا۔ تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہماری تمام اصنافِ سخن میں غزل ہی سب سے زیادہ جاندار، دلکش اور متنوع کی حامل صنفِ سخن ہے۔ داخلی اوصاف، پیرایۂ بیان، لب و لہجہ کی مسکینی، یا البیلا پن، دھیمی دھیمی کسک، چاندنی راتوں کی جلن، محبوب کی درد انگیز مگر دل نواز ادائیں۔ غم کی پاکیزگی اور آنسوؤں کی دھندلی دھندلی فضا، یہ سب کچھ ایک معیاری لطافت و شرافت کے ساتھ

غزل کی تاثیر میں بڑا اضافہ کر دیتے ہیں۔ غزل کا مزاج ظاہر ہے کہ شوریدگی، تُندی اور تیزی کا حامل نہ ہوگا۔ یادہ گوئی، چوما چاٹی، اُچھل کود اور دھما چوکڑی بھی غزل کو راس نہ آئے گی۔ عاشقانہ وارفتگی، صوفیانہ اضطراب انگیزی اور دلبرانہ لذت بخشی غزل کے نہایت ضروری عناصر ہیں۔ عصرِ حاضر میں ہمارے نئے غزل گو شعراء نے غزل کے علائم کو جس دردمندی، حزن و یاس اور جینے کی آرزوؤں سے آشنا کیا ہے وہ میرے دعوے کا ثبوت ہے۔ ناصر کاظمی، شہزاد احمد، شکیب جلالی مرحوم کے لب و لہجے میں درد آمیز نغمات اور معنوی وسعت ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی غزلیات میں کون و مکاں کی آفاقیت اور معاشرے کا خلفشار ایک معتدل اور لطیف آہنگ میں ڈھل رہا ہے۔ اس کا کرب ایک دل شکستہ کا اضطراب تو ہے لیکن زلزلوں اور طوفانوں کے جھٹکوں اور ہچکولوں کا آشوب و قہر نہیں۔ خالدہ کی غزلوں میں بھی دردمندی اور دھیمے دھیمے درد کی فضا ہے۔ چند شعر "کفِ دریا" سے سُنیئے ؎

رہے نہ تجھ کو وہ سوگند و عہد و پیماں یاد
جو بات حاصلِ شب تھی وہ بات بھول گئی

—— ٭ ——

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم با وفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا

—— ٭ ——

بے خطا مجھ سے رُوٹھنے والے
میں تمہاری نہیں تو کس کی ہوں

—— ٭ ——

گگن سے چاند اُٹھے دیکھنے کو رات ڈھلے
کدم کے پیڑ تلے بانسری بجائے کون

—— ٭ ——

ہے مجھ کو دل سے محبت بدن کا علم نہیں
مرا بدن تو کئی دن تمہارے ساتھ رہا

توڑ کر آسمان سے تارے
اپنی زلفوں میں اُس نے گوندھ لئے

آہوئے وحشی نے شاید تم سے سیکھی ہے ادا
چوکڑی بھرنا، پلٹ آنا، ٹھہرنا، دیکھنا!

رنگ ونغمہ سے یہ معمور فضا اور شوخی وروانی کے یہ لہرے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔لب ولہجہ اس کے مزاج کی سنجیدگی اور خوش طبعی کا پوری طرح حامل ہے۔ پھر اندازِ بیاں میں ایک تازگی اور ندرت ہے، تطویلِ زلفِ دراز کے لئے آسمان سے تارے توڑنے والا شعر کتنا خوبصورت ہے۔ یا محبوبہ کے بہلاؤں کے لئے آہوئے وحشی کی ادا سے استعارہ کس قدر مسحور کن ہے۔

دامن کو چاک کرکے، دل کو فگار کر کے
کیا اعتبار کھویا، کیا اشتہار پایا

جو زبان اس کے مندرجہ بالا شعر میں برتی گئی ہے۔ یہ صحیح اردو غزل کی زبان ہے ۔ چند رواں دواں اور نہایت ہی خوبصورت اشعار سُنئیے :۔

رہینِ زر نہیں فن کار کی ہنرمندی — سفارشات سے سوزِ نہاں نہیں ملتا
کنارِ بحر پہ غوّاص رُو بہ قبلہ ہے — کہ بے دُعا گہرِ شائیگاں نہیں ملتا
شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہیں ہوتی — فسادِ زخمِ جگر کا نشاں نہیں ملتا
کوئی مقام بھی ناممکن الحصول نہیں — کوئی مقام بھی بے امتحاں نہیں ملتا

(زنجیرِ رمِ آہو)

ہر چند کہ ناممکن الحصول کی ترکیب بہت بھاری تھی، مگر بحر کے آہنگ نے اسے قبول کر لیا ہے۔

یہ شغلِ سینہ کاوی اور آئینِ حسن کاری بڑا مبارک ہے۔ لیکن دلگدازی اور جذبۂ الفت کی جاں سوزی کا طالب ہے۔ فکر و فلسفہ کے لئے لب و لہجہ بڑا حکیمانہ اور انتہائی شاعرانہ ہے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ بحر اور لب و لہجہ کی ہم آہنگی نے خیالات اور طرزِ ادا میں کتنا حسن اور کتنی عظمت پیدا کر دی ہے ؎

آشوبِ آگہی سے چھٹتا ہے کیسے انساں — اِس عمرِ رائیگاں کا مصرف کوئی بتاؤ

ہر سمت منتشر ہیں، اوراقِ شاخِ مرجاں — اے عبرتِ تماشا کف در دہاں ہے دریا

آوارگانِ فطرت رہتے ہیں پا بہ جولاں — آب و ہوائے جنت ہم کو نہ راس آئی

(زنجیرِ رمِ آہو)

بحر کا انتخاب اور الفاظ کی در و بست ان تمام اشعار کو نیر و نشتر بنا گئی۔ یہاں فکر یہ معانی اور شاعرانہ نغمہ خوانی ایک دوسرے میں یوں تحلیل ہو گئے ہیں کہ اقبال کی ہنرمندی اور ندیم کی غزلیہ افسردگی بے اختیار یاد آجاتی ہیں۔

تراجم

"غزل الغزلات" کتاب نشید الانشاد THE SONG OF SONGS کا ترجمہ ہے اور انہوں نے اس کتاب النغم کے لئے King James' Version پر انحصار کیا ہے۔ انگریزی میں ادبیات سرائیلیہ کے مشہور مترجم ISRAEL ZANGWILL —— Nina Salaman Murice Samuel اور Matie Syrkin وغیرہ ہیں۔ ان نغموں کی زبان بڑی رواں دواں اور مترنم ہے۔ لیکن اس کتاب کا بڑا افادی پہلو یہ ہے۔ کہ جس طرح عربی زبان کے مطالعہ کی بدولت یورپ کے ادب پر عربوں کے اثرات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح غزل الغزلات کی شاعری کا عربی زبان و ادب پر اثر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ان گیتوں کا ترجمہ اس قدرتِ فن اور

دل سوزی سے کیا گیا ہے کہ ان پر ترجمہ کا مطلق گمان نہیں گزرتا۔

اے بتِ مشکیں کلالہ لے مہِ بیجادہ لب

صبح قاقم پوش کیا

شام اکسوں باف کیا

زلف اک تر وار سنبل! چہرہ اِک گلزارِ گُل

خوشنما ہیں گال تیرے کاکلِ خمدار میں

اور صراحی دار گردن موتیوں کے ہار میں

ان گیتوں میں زراعیہ شاعری کا حُسن، قیدار کے آباد گاؤں اور دیہات کی سر سبزی، عدنان و سلیمان کے خیموں سے آتی ہوئی خوش آئند آوازیں، لمحے کی قید میں گرفتار دلوں کی فریادیں، اور مظاہرِ حیات سے گہرے ناطے رشتے، چھوٹی چھوٹی آرزوؤں و ازلی اور ابدی آنسوؤں کی لرزشیں غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو مذہب بار آوری کی بہاروں اور سرمستیوں کا سبب و نتیجہ بنا کرتا ہے خالد کو اِن خاصے مشکل گیتوں کو SPEAKING VERSE میں ڈھالتے ہوئے خاصے صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اور شکر ہے کہ انہیں اس میں کامیابی ہوئی ہے ع

آہے کشیدہ ایم و بیاباں رسیدہ ایم

سیفو یونان کی مغنیۂ سِحر نوا، مطربۂ قدسی نفس اور شاعرۂ ہوش ربا ہے۔ خالد نے اس کی چھوٹی چھوٹی نظموں اور خیال پاروں کا بڑی چابکدستی سے ترجمہ کیا ہے۔ ان کے یہ تراجم لاریب ہماری ادبی اور تہذیبی روایتوں میں بڑے خوبصورت اضافے ہیں۔ اس کا زمانہ ۶۱۰ قبل مسیح ہے۔ انگریزی میں اس کے مشہور مترجم William Ellery Leonard Allen Tate Lord Byron D.G. Rosetti Walter Savage Landore Edwin Arlington Robinson وغیرہ ہیں۔ سیفو کو یونان کی دسویں میوز (افلاطون) کہا گیا ہے۔ اس کے کلام کے بارے میں انگریزی کے مشہور شاعر سوئن برن Algernon Charles Swin Burne کی یہ رائے ہے:۔

"اس کے حریم نغمہ اور معبد ریاضت و ایثار کی دہلیز شکستہ سے باہر اس کے نغمات کی یہ بدلی ہوئی صورتیں جو ہم تک پہنچی ہیں انہیں دیکھ کر یونان کی عظیم ادبی روایات سے کامل طور پر اتفاق کرتے ہوئے میں نے سیفو کے کلام کو ہر طرح معیاری پایا ہے۔ بلا شک وشبہ وہ ایک کامل ترین اور کسی بھی عظیم تر شاعر سے کسی حیثیت میں کم نہیں!"

سیفو کی زندگی میں کئی موڑ اور پیچ وخم آئے۔ جلا وطنی اور دربدری کے علاوہ اسے جگری دوستوں، اور ہجولیوں سے بھی دُکھ پہنچے اور انہیں باتوں سے اس کے کلام میں ایک دل شکستگی، نوائے قمری کی سی نغمگی اور کوئلوں کی کُوک سے ملتی جلتی ہُوک اور کسک پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے کلام میں کسی تعجب کے سُر اونچے نہیں۔ بلکہ یہ سُر دھیمے دھیمے، میٹھے میٹھے اور ایک درد انگیز فکری عظمت اندرونی حسن اور دلی محبت کے آئینہ دار ہیں۔ بعض اشعار بتانِ عشوہ ادا کے ان شیوہ ہائے دلنواز کی طرح ہیں۔ جنہیں کوئی نام ہی نہیں دیا جا سکتا۔ سادہ، پُر تاثیر اور سہل ممتنع کے نمونے، مگر خالد صاحب نے یہاں بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ یونانی ذہن کے کرب ومسرّت کا اندازہ کرنا یوں بھی کوئی آسان کام نہیں چہ جائیکہ وہ سیفو جیسے آسمانی ہستی کے ملکوتی حزن وملال اور انسانی سطح پر تذکرۂ ہجر ووصال کا ترجمہ ہیں۔ دشتِ وفا میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے والی ذات کے یہ آنسو تاجِ شہرتِ دوام کے نگینے بن گئے ہیں۔ زبان کی مٹھاس، لہجے کی نرمی، گیتوں کا سوز وساز، نظموں کا رمزیہ انداز اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی آرزوئیں سب کچھ ان گیتوں میں فن کارانہ طور پر منتقل کیا ہے۔

ہم روز بروز مخصوص سیاسی نظریات اور معاشی تصوّرات میں الجھتے جا رہے ہیں، اپنی تہذیبی صداقتوں اور ملّی شرافتوں سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ آج اخلاقی عقیدوں اور حقیقتوں کے معانی بدلتے جا رہے ہیں اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری ہی ایک ایسا ہتھیار اور ہمارا آخری حربہ ہے۔ جس سے ہم ان جان لیوا قوّتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ زندگی سے ناہموار اور ناشائستہ پہلوؤں کو ایک انقلابی وجدان اور شاعرانہ زورِ بیان ہی سے مہذّب اور متمدّن بنایا جا سکتا ہے۔ مذہب اور اخلاق خاص طور

پر ان یلغاروں کی زد میں ہیں۔ علومِ جدیدہ کی یلغار، سائنسی انکشافات اور ایجادات کے سیلاب میں مذہب، زندگی، ادب اور حُسن سب کے سب گھرے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اور اسی قلمی جہاد اور اجتہادِ فکر و نظر کی ضرورت ہے۔ جو تنقید میں جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ، جناب استاذی سیّد وقار عظیم اور نظموں میں مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، ن۔م راشد اور عبدالعزیز خالد میں پایا جاتا ہے۔ خالد کے یہاں ملّت کا احساس، اپنی تہذیب کا غم اور عرفانِ حیات کسی منضبط فلسفہ کا حامل تو نہیں البتہ شاعرانہ بصیرت و بصارت کا پوری طرح حامل ہے۔ اور فلسفہ میں رکھا بھی کیا ہے، تسکینِ صبر اور مضیٔ ما مضیٰ کے علاوہ فلسفہ کے پاس کچھ نہیں۔ لیکن شاعرانہ افکار میں تو پا لینے، بڑھنے، جھپٹنے اور چھا جانے کا سبق ملتا ہے۔ قابیل کے سوزِ ناتمام اور ہوسِ خام سے لے کر آشور بنی پال کے انجامِ مردانہ تک۔ باعور کے نشۂ بالیدہ سے لے کر سلومی کے دلِ گزیدہ تک خالد کی ہر سطر پیکِ جمال اور ایک فانوسِ خیال ہے۔ اتفاقات کے یہ نیرنگ، واقعات کے یہ طلسمات اور طالعِ بشری کے حیرت انگیز انقلابات ہمارے حفظِ ناموس، حُسنِ معاشرت، کاہشِ اندوہ فراق اور شورشِ شب ہائے وصال کی خوبصورت تصویریں ہیں۔ یہ زبوں کامیٔ دل کی تشہیر نہیں بلکہ غم کی آگ میں تپا کر ہمارے فکر و احساس کی تطہیر ہے۔ ان منظومات و ترتیبات و تمثیلات میں طبیعت کا رنگ ریاکاری نہیں بلکہ ایک شاعر کی فن کاری اور اس کے انداز و اسلوب کی مکمل طرحداری ہے۔

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

عہد آفریں شاعر

خالد کے متعلق جو سب سے پہلی اطلاع مجھے ملی وہ یہ تھی کہ خالد بے حد مشکل پسند شاعر ہے۔ اس کے ہاں غنائیت نام کو نہیں۔ وہ بڑی بڑی کہانیوں کو نظم کرتے ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور دوسری زبانوں کے ثقیل الفاظ وہ اپنی نظموں میں روانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ انہیں سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ فلسفہ کی کتاب پڑھ رہے ہیں اور کبھی ان کی شاعری تاریخ معلوم ہوتی ہے ــــــ ان باتوں نے مجھے چونکا دیا، اور میں نے ان کی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ شروع شروع میں تو واقعی مجھے کروٹیں بدلنی پڑیں۔ عربی اور فارسی کے جب ثقیل الفاظ آنے لگے تو مجھے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اور یہی وقت تھا کہ مجھے گھبرا کر اسے چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔ لیکن ایک بات میں نے بڑی شدت سے محسوس کی اور وہ یہ کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ایسی باتیں جو اقبال کے بعد شاعروں نے کہنا بند کر دی تھیں۔ خالد نے اس کا یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ تاریخ کا سہارا لے کر دل سے نکلی ہوئی باتیں دل میں اُتارنے کی سعی کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں بے حد ادبی خلوص ہے۔ لیکن ان کی ایک سطح ہے جہاں سے وہ مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ کوشش کے باوجود بھی اس سطح سے نیچے نہیں اُتر پاتے۔ ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں نے ان کی اس سطح کو ان کا مخصوص پلیٹ فارم بنا دیا ہے۔

خالد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ خالد کی شخصیت کو سمجھا جائے۔ خالد کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ انجیل، زبور، توریت انہوں نے تفصیل کے

ساتھ پڑھی ہیں مختلف مذاہب میں خدا کا جو بھی تصوّر ہے، اس سے وہ واقف ہیں اور اس کے لئے انہوں نے دُنیا کی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور بہت سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان تمام قوموں کی تاریخ کو وہ قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کے عروج وزوال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ان سب باتوں کو وہ نظم کرنے کی بھی قدرت رکھتے ہیں، بلکہ قادر الکلام ہیں۔ انہوں نے موجودہ دَور کے مختلف نظریات کا مطالعہ کیا ہے، جس میں مغربیت، مادیت اور اشتراکیت خاص ہیں۔ انہوں نے معاشرے کی فکری، اور اخلاقی قدروں پر بھی توجہ دی ہے۔ سرمایہ دار اور مزدُور کی موجودہ کشمکش کا بھی ان کے ہاں تذکرہ ہے۔ غرض وہ کہیں بند نہیں ہیں۔ ان کی زبان میں وسعت ہے۔ نظریے واضح ہیں، ذہن سُلجھا ہوُا ہے۔ انتخاب الفاظ کے وہ ماہر ہیں۔ بڑے بڑے واقعات وہ تاریخی تلمیحات کے ذریعے بڑی آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ اُن کی اختراع کردہ تراکیب بھی غضب کی ہیں۔ اسلامی تاریخی اور صنمیاتی ڈراموں کو جس طرح انہوں نے منظوم کیا ہے وہ بہت کم شعراء کے ہاں نظر آتا ہے۔ خالدؔ کے ہاں خیالات اور احساسات کی کمی نہیں لیکن یہ بھی نہیں کہ وہ خیالات اور احساسات کی خاطر شاعر کی فنّی خوبیوں کو نظر انداز کر جائیں۔ وہ صاحبِ طرز شاعر ہیں اور اپنی علمی اور ادبی حیثیت سے کہیں بھی نہیں گرنے پاتے۔

اسلوبِ بیان کے لحاظ سے خالدؔ اور دُوسرے شاعروں سے بالکل الگ نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب منفرد ہے۔ ان کے اسلوب میں علمی پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ خالدؔ کے اسلوب کی جب بات آتی ہے، تو مجھے قُرۃُ العین حیدر کا اسلوب یاد آجاتا ہے۔ قُرۃُ العین حیدر کا میدان نثر ہے۔ ناول اور افسانہ میں بھی محض ان کے اسلوب ہی کی وجہ سے اکثر لوگ ان کی تحریروں سے بدکتے ہیں، اور زیادہ دُور تک ان کے ساتھ نہیں چلتے، اُنہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی اجنبی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے، کہ قرۃ العین حیدر کو اردُو ادب میں ایک مخصوص حلقہ میں ہی پڑھا جاتا ہے۔ دُوسرے لوگ تو اسے اپنے معیار کی چیز نہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی حال خالدؔ کی شاعری کا ہے۔ خالدؔ کی شاعری کو بعض پڑھے لکھے لوگ بھی زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تھوڑی دُور چل کر اور محض مشکل سمجھ کر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

غالبؔ کے زمانے میں غالبؔ کو ان کے مخصوص اسلوب بیان کی وجہ سے "یا اپنا کہا آپ سمجھیں یا

خدا سمجھے" کہا جاتا تھا۔ یہاں میرا مقصد خالد کی شاعری کا غالب کی شاعری سے موازنہ نہیں ہے۔ غالب کا میدان دوسرا ہے۔ خالد غالب کی طرح مشکل پسند ضرور ہیں لیکن ان کی نظموں میں گہرائی اور گیرائی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مقصدیت کو نہیں بھولتے۔ اس سلسلے میں تو وہ حالی کے پیرو ہیں۔ لیکن ان کی یہ مقصدیت ایسی نہیں ہوتی کہ فن مجروح ہو جائے۔ ان کے اشعار میں شعری حسن ہر جگہ ملتا ہے۔ خالد کی غزلوں میں غنائیت کا پہلو بھی ہے اور وہ آہستہ آہستہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ جو لوگ محض شاعر ہیں اور علمی طور پر زیادہ گہرائی نہیں رکھتے وہ وہاں سے بور ہونا شروع ہو جاتے ہیں جہاں سے ان کی علمیت ختم ہونے لگتی ہے۔

خالد نے اردو الفاظ کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ یوں تو اردو شاعری میں سب سے زیادہ الفاظ ہمیں میر انیس نے دیئے۔ انیس الفاظ کے بادشاہ تھے اور جس طرح چاہتے الفاظ تراش لیتے۔ ان کے بعد اقبال اور جوش نے نئے نئے الفاظ تراشے اور اردو ادب میں بے بہا اضافہ کیا اور اب خالد اسی کام میں مصروف ہیں۔ وہ زبان جس میں ترقی کی گنجائش نہ ہو جو نئی اصطلاحات اور وضاحت سے قاصر ہو وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ اردو زبان میں بڑی وسعت ہے، لچک ہے، خالد الفاظ تراشتے ہوئے عربی اور فارسی کا بہت سہارا لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندی کے بہت سے الفاظ جو کہ اپنی نوعیت سے شیریں بھی ہوتے ہیں، خالد اپنی نظموں تک میں بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ اردو میں گیتوں میں ہی ہندی الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ اور بہت ہوا تو کسی نے غزل میں بھی ہندی لفظ استعمال کر لیا۔ لیکن نظم میں ہندی لفظ کسی حد تک نہ ہونے کے برابر تھے۔

جوش کے ہاں بھی الفاظ کا بے حد ذخیرہ ہے۔ لیکن ان کے اسلوب میں کیونکہ گھن گرج زیادہ ہے اور وہ اپنی نظموں میں ان الفاظ سے "انقلابیت" پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے ان کی نظمیں زیادہ گہرائی میں نہیں جاتیں۔ ان کی نظموں کا اثر بعض اوقات بے حد تیز، مگر مختصر عرصے کے لئے ہوتا ہے۔ بات دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتی نہ اس کے تاثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ الفاظ بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں میں جوش اور خالد کا بھی موازنہ نہیں کر رہا۔

جوشؔ کی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں۔ اردو ادب میں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے نظریات "انقلابیت" کی وجہ سے کچھ دوسرے ہیں۔ وہ انقلابی ہیں اور ان کا مسلک انقلاب کی تبلیغ و تشریح ہے۔ اور انقلابی فضا کو قائم رکھنے کے لئے انہیں گھن گرج والے الفاظ کا سہارا لینا ضروری بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ فضا جسے وہ "انقلاب" کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، قائم نہیں رہ سکتی۔ خالدؔ کے ہاں ایسا کوئی معرکہ نہیں ملتا۔ وہ مادیّت پرست نہیں اور نہ وہ اشتراکیّت کو اپنے اوپر مسلّط کرنے کے حامی ہیں۔ خالدؔ کا نظریۂ حیات خالص اسلامی ہے۔ ان کے نظریات میں اعتدال ہے۔ ان کے ہاں انقلاب کے معنی وہ ہیں جو اسلام نے متعیّن کئے ہیں۔ وہ کارل مارکس، لینن اور اینجلز وغیرہ کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔ ان کی جو تاریخی حیثیت ہے اس سے وہ واقف معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کا تذکرہ بھی اکثر جگہوں پر کیا ہے۔ مزدور کی زبوں حالی اور سرمایہ دار کی خرمستیوں کا اقبالؔ نے بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس شدّت سے کیا ہے کہ اگر کسی نے اقبالؔ کی صرف وہی نظمیں پڑھی ہیں تو وہ ضرور ان کو مارکسؔ کا معتقد سمجھے گا۔ دراصل مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش اس قدر اہم ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی اصلاح کے لئے جو طریقہ کار اشتراکی اختیار کرتے ہیں وہ انتہا پسندی ہے۔ وہ معمولی سی بات پر بھی تشدّد کو واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور خونیں انقلاب کا تصوّر ان کے ہاں سب سے پہلے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اشتراکیّت میں حد درجہ تشدّد کو ذریعۂ اصلاح نہ بنایا جاتا تو مساوات جلد قائم ہو سکتی تھی۔ خالدؔ بھی اشتراکیوں کی اس انتہا پسندی ہی سے نفرت کرتے ہیں۔ مادیّت پرستی نے اخلاقی اقدار کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اور پورا مغرب اس سیلاب کی نذر ہو گیا ہے۔ انسانیت کے احساسات اور جذبات کا کہیں احترام نہیں ملتا۔ اس مشینی دور میں انسان کو بھی مشین بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ خالدؔ اسی المیئے کا ماتم کرتا ہے۔ اسے انسان کے ہاتھوں انسان کی عظمت کو مٹتے دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ جس انسان نے آلامِ دہر کو گلزار میں تبدیل کر دیا وہ خود اب اپنی تباہی

کے درپے ہے۔ خالد ہمیں قدم قدم پر انسانی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ہم سوچیں کہ ہم ہیں کیا اور ہماری تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور ہم کر کیا رہے ہیں۔ لیکن اس کے لیئے خالد نے سختی استعمال نہیں کی۔ وہ بہت دھیمے سُروں میں مگر مؤثر انداز سے ہمیں احساس دلا رہا ہے۔

دراصل خالد کے پاس ایک مشن ہے، ایک پیغام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی آواز بے سُری نہیں ہوتی۔ وہ زندگی سے قریب ہو کر سوچتا ہے اور فرار کی راہوں پر کڑی تنقید کرتا ہے آج مادیّت پرستی نے زندگی سے فرار کی ایک عام وبا پھیلا رکھی ہے۔ ستاروں پر کمند پھینکنے والے انسان، سمندر کا سینہ چیرنے والے انسان کو مادّیت پرستی مایوسی کا سبق دیتی ہے۔ مایوسی بُزدلی کو جنم دیتی ہے اور بُزدلی انسان کے کردار میں ہر طرح کی خرابیاں پیدا کر دیتی ہے اور مایوس انسان زندگی کی عظمت کا مُنکر ہو جاتا ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے زندگی سے فرار۔ عام طور پر پڑھے لکھے لوگ کبھی زندگی سے فرار کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ خالد ان نظریات کی تردید کرتا ہے۔ وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں انسان کی عظمت کا ذکر کر کے ہمیں احساس کی دولت بخشتا ہے۔

خالد نے فکرِ سخن میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ بلکہ اسے ریاضت کے طور پر برتا ہے۔ بہت مختصر سے عرصہ میں انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ زُود گو ضرور ہیں لیکن پُر گو ہیں وہ مشاعروں کے شاعر نہیں، بہت خاموشی سے کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ یونانی اور عبرانی ادب سے واقفیت کی بنا پر انہوں نے سیفو کے نغموں کو اُردو دان طبقے سے متعارف کرایا ہے۔ تعریف یہ ہے کہ ان کے منظوم ترجمے میں شعری حُسن اسی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ سیفو کے نغموں میں جو اثر ہے وہ بھی ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے۔ انہوں نے "گیتان جلی" کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے میں خالد نے فنی حُسن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اُردو دان طبقہ جو یونانی اور عبرانی اور عربی سے زیادہ واقف نہیں۔ ان کے لیئے یہ منظوم کیئے ہوئے ڈرامے، قصّے اور داستانیں

بڑی اہم ہیں۔ وہ ان منظوم ڈراموں میں عربی اور فارسی کی خوبصورت تشبیہات اور تلمیحات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک نئی آواز ہے، نیا طرز ہے، نیا انداز ہے، نئی شاعری ہے۔ پُرانی ڈگر سے ہٹ کر جو خدمت خالد انجام دے رہا ہے اسے اردُو ادب میں قابلِ قدر اضافہ شمار کیا جائے گا!

"فارقلیط" بڑی ضخیم کتاب ہے جس کی تخلیق میں خالد نے بڑی جگر کاوی کی ہے۔ قدیم زمانے کے اسماء، القاب اور تشبیہات و تلمیحات کا اس روانی سے استعمال بہت مشکل تھا۔ یہ ایک قادرالکلام شاعر کے ہی بس کی بات تھی۔ یہ ایک نعتیہ نظم ہے اور سات ابواب میں تقسیم ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے فارقلیط کی پیشین گوئی کی تھی۔ پوری نظم اختتام تک غزل کے انداز سے قوافی اور ردیف کی پابند ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خالد کے ہاں آمد ہے۔ اس کے ہاں جذبہ ہے علمیّت ہے۔ ان کے ہاں پوری پوری آیتیں، فقرے اور جُملے مصرعوں کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان کے ہاں بڑی روانی ملتی ہے اور کہیں کہیں جو بوجھل پن یا مشکل پسندی نظر آتی ہے اسکی وجہ خالد کی انفرادیت ہے۔ اس کا مخصوص پیٹ فارم ہے۔ شاید کچھ اور عرصہ گزرنے کے بعد لوگ پسند کرنے لگیں گے اس لئے کہ خالد کے ہاں جو باتیں ہیں وہ دُوسرے شعراء کے ہاں کم ہی ملتی ہیں۔

"سلومی" خالد کا منظوم ڈرامہ ہے۔ آسکر وائلڈ نے جس فنکارانہ انداز سے اسے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے غالباً خالد کے پیش نظر یہی ترجمہ رہا ہے۔ اس میں فنی نزاکتیں، ڈرامائی معراج اور شعری حُسن موجود ہے۔ کسی بھی ڈرامے کو منظوم کرنے کے لئے شعر گوئی کی مکمل صلاحیتیں اور قادرالکلامی ضروری ہے ورنہ بہت سی چیزیں رہ جاتی ہیں اور اصل چیز کی ترجمانی نہیں ہو پاتی۔ یہ بڑا مشکل فن ہے لیکن خالد نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ بلکہ اظہار و بیان کے نئے راستے متعین کئے ہیں۔ آنے والی نسلوں کے لئے میدان ہموار کیا ہے۔ بقول جمیل جالبی "اس ڈرامے میں جس انداز سے جذبات کا اظہار ہوا ہے۔ احساسات جس طور پر بیان ہوئے ہیں فضا کو جس طرح قائم رکھا ہے۔ ذہنی کیفیات کی لطیف ترین تہوں کو جیسے برقرار رکھا ہے اس

سے اردو شاعری میں ایک متحرک آواز کا احساس ہوتا ہے۔ رسلومی ایک ایسے ہی سنجیدہ انسان کی سنجیدہ ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جس میں شاعری بھی ہے۔ ڈرامائی کیفیت بھی ہے امیجری اور شاعری کے اعتبار سے یہ ڈرامہ پڑھنے کے قابل ہے۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ کاش کوئی مردِ غازی اس کو اسٹیج کر سکتا اس ڈرامہ کی خوبصورتی اور حسن کا اندازہ صحیح معنوں میں اُسی وقت ہو سکتا ہے۔" (نیا دور، شمارہ ۱۲، ۲۲، ۳۹۳)

"لحن صریر" خالد کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رباعی کے فن کے لیئے شاعر خلّاقی اور قادر الکلامی کے ساتھ بحر کا گہرا شعور نہ رکھتا ہو تو وہ اس فن پر قابو نہیں پا سکتا۔ رباعیوں میں موسیقی کی دُھنوں کا ادراک رکھنا یوں بھی ضروری ہے ورنہ رُباعی فنّی نزاکت سے محروم رہ جائے گی۔ خالد کے ہاں بڑی مترنّم لَے ہے۔ اور وہ اپنے کلام میں رنگ بھرنے کے ماہر بھی ہیں۔ ان کے ہاں سوز و گداز بھی ہے۔ صرف چار مصرعوں میں اپنے ہمہ گیر خیالات و افکار کو پیش کرنا اس فن کی معراج ہے۔ خالد نے جس خوش اسلوبی سے اپنے اِن وسیع اور ہمہ گیر مشاہدات اور تجربات کو ان رباعیوں میں پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حِصّہ ہے۔ خالد ایک خلّاق شاعر ہیں ان کی یہ رباعیاں بے حد بصیرت افروز ہیں اور انہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لیئے شرط یہی ہے کہ پڑھنے والا قرآن اور حدیث کا گہری نظر سے مطالعہ کر چکا ہو۔ عربی اور فارسی سے واقف ہو اور اسے اپنی تاریخ سے بھی اُنس ہو۔ خالد میری نظر میں واحد شاعر ہیں جنہوں نے اتنی سی مختصر مدّت میں اتنی شہرت حاصل کی ہو۔ علم دوست طبقے سے انہوں نے خاصا خراجِ تحسین حاصل کیا ہے یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ اِس قدر تلمیحات اور مصطلحات استعمال کرنے کے عادی ہیں کہ عام پڑھنے والے کی قابلیّت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ فکر و موضوع کے لحاظ سے خالد کا جو مرتبہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:-

"خالد کی شاعری کی لَے حالی اور اقبال کی اصلاحی لَے سے ملتی جلتی ہے یعنی ان کی شاعری ایک ایسے فرد کی آواز ہے جو مسلمان قوم اور ملّتِ اسلامیہ کے لیئے فطرت کی جانب سے ایک دردمند دل لے کر آیا ہے اور یہی دردمندی خالد کو شاعر کے

منصب تک پہنچاتی ہے"۔ (نگار پاکستان۔ فروری ۱۹۶۹ء ص ۱۰۷)

خالد کا اپنا اندازِ نظر ہے۔ اپنا اسلوبِ بیان، اپنی طرزِ فکر اور خیال آفرینی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تخیل ان کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ وہ قرآن کے حوالے بڑی فراوانی سے دیتے ہیں۔ اسلامی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

شاعر طبعاً دردِ دل نگر ہوتا ہے ۔۔۔ از سرتا پا قلب و نظر ہوتا ہے
رہتا ہے وہ اپنے آپ میں گم لیکن ۔۔۔ اخبارِ جہاں سے باخبر ہوتا ہے

اپنے متعلق کہتے ہیں ؎

اے جانِ عزیز! خالدِ گوشہ نشیں ۔۔۔ گو ابنِ بطوطہ و ہیون سانگ نہیں
گھر بیٹھے جہانیاں جہاں گشت بنا ۔۔۔ ہے قاطعِ اقطارِ سماوات و زمیں

زہراب کو انگبیں بنا لیتا ہے ۔۔۔ اِلحاد کو جزوِ دیں بنا لیتا ہے
ہے انفس و آفاق میں جو شے بھی اُسے ۔۔۔ شاعر مِلکِ یمیں بنا لیتا ہے

خطابت ملاحظہ ہو ؎

اے دیدہ درو! مقررو! نغمہ گرو! ۔۔۔ جو سچ ہو وہی زبان و خامہ سے کہو
ہم عصروں میں کٹی چھنی رہتی ہے ۔۔۔ جھگڑوں پہ تعلقات القط نہ کرو

چند رباعیاں اور پیشِ خدمت ہیں ؎

رم خوردہ انکار، مجرد ہیں حواس ۔۔۔ ہو زخمہ زن سازِ تفکر احساس
سمجھو نہ اساطیر و قصص کو بیکار ؛ تِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ

؎ جب تک نہ ہو آزادیٔ اظہار و بیان ۔۔۔ ناممکن ہے نشو و نمائے انسان
ہو جس میں نہ تاب و تبِ ادراک و شعور ؛ ہے ہر دو جہاں میں رائیگاں وہ ایمان

ہے قلب و زباں دونوں پہ حق حق کی صدا
ناداں ہیں یہ دونوں ان کی بخشش فرما
اغفرلی عمدی و خطئی یا رب!
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت سے بچا

دِل شکوہ سرا ہے بے مقدوری کا
لب پر ہے اَنَا اَھلُ التَّقویٰ کی صدا
ہوں میں بھی اَبُو العَتَاہِیہ کی طرح
خوش مجھ سے نہ دِل میرا، نہ شیطاں، نہ خدا

مٹّی کا یہ برتن اِک دن آخر ٹوٹے
جیون پتھ کا ساتھ ہے کچّا، چھوٹے
آمَنتُ بِکَ رَبِّ تَوَکَّلتُ عَلَیکَ
ہیں تیرے سوا سارے سہارے جھوٹے

عاقل کی اقامتِ مکاں ہو اکثر
جاہل کی سیاحت جہاں سے بہتر
قُل سِیرُوا فِی الاَرضِ پہ کرتے ہیں عمل
ہم گوشہ نشین ہیکلِ فکر و نظر

انجام دے کیسے خدمتِ فنکاری؟
واقف نہیں چھند شاستر سے بھی کوی
ہے اہلِ سیاست کا اَدَب پر قبضہ
چوروں کی نگری ہے خدا کی بستی

کم کھانا، کم سونا، اکثر رونا
اکسیر ہے مٹّی کو بنا دے سونا
کُلُّ بَنِیٓ آدَمَ خَطَّاءٌ لیکن
خَیرُ الخَطَّائِینَ التَّوَّابُونَ

زر دوست، ہوا پرست، خود بیں، شاطر
حلّافِ مہین اور کذّابِ اَشِر
پایا وطنِ پاک کے دانش ور کو
نازاں عصبیّت، پہ جہالت پہ مُصر

خالد خیالات کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھتا ہے اور اُس نے ہمیں ادب کے میدان سے انمول

موتیوں سے پر پیپلیاں پیش کی ہیں۔ سیفو کے نغموں کے ترجمے کو پڑھ کر جعفر طاہر نے کہا تھا۔

"اگر شعراء کی رُوحیں مرتی نہیں تو میرا ایمان ہے کہ خود سیفو بھی اس عمدہ ترجمے پر پھڑک اُٹھی ہو گی!"

"گیتانجلی" کا ترجمہ آیا تو مخمور سعیدی نے کہا۔

"گُلِ نغمہ" کی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ایک ایسا شخص بھی جس کے لئے مہاکوی کی شاعری کا راست مطالعہ ممکن نہیں، ان کے شاعرانہ اوصاف محاسن سے متاثر اور لطف اندوز ہو سکتا ہے۔"

"زنجیرِ رمِ آہو" کی اشاعت پر رئیس امروہوی نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا:۔

"زنجیرِ رمِ آہو" میں خالد کے شعر کی غنائی، احساسی، تخیّلی اور معنوی طبع زاد کیفیت اور ندرت پوری طرح ٹپک رہی ہے:" ع ستارہ شکنند آفتاب می سازند"

"غزل الغزلات" پر "جنگ" نے لکھا۔

"غزل الغزلات، نغمۂ سلیمان کا ترجمہ، گلہ بانوں، صحراؤں، نخلستانوں، انگور زاروں اور شاہانہ جمال و جلال کی شاعری بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر (مترجم) نے نئی شاعری کے لئے نئی زبان ایجاد کی ہے۔ اس طرح ہمیں اردو شاعری کے معنوی افق کا اندازہ ہوتا ہے۔"

اور "سلوی" کی اشاعت پر "ساقی" میں اس بات کا اقرار کیا گیا کہ بلینک ورس اور فری ورس کو انگریزی ہی نہیں، اُردو میں بھی حُسن و خُوبی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ "منحمنّا" میں یوں تو نعت گوئی ہی ہے لیکن یہاں بھی ان کے ہاں انفرادیّت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ عام شعراء کے انداز سے کچھ ہٹ کر اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ ابتدا اس طرح کرتے ہیں ؎

مُطاعِ آدم و انجم متاعِ لوح و قلم ۔ محمّدؐ اُمّیِ محبُوبِ کبریا، صلعم
محمّدؐ انجمنِ کُن فکاں کا صدر نشیں ۔ محمّدؐ افسرِ آفاق سرورِ عالم

وہ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وہ اِسْمُہٗ احمدؐ | کتاب وحکم و نبوّت کا خاتم وخاتمؐ

فصاحت وبلاغت ملاحظہ ہو۔ ایک ہی مادہ کے اسمائے صفاتی کس طرح استعمال کرتے ہیں:۔

محمود و حامد و احمد، محمّد و محمود | کریم و میر کراہم و مُکرّم و اکرم

ہے جس کا وصف بیاں کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن | جو ہر جہت سے ہے فخم و مفخّم و افخم

خدائے لَمْ یَزَل و لایزال کا کلمہ | نشیدِ سلم وسلام وصلوٰۃ و حمد و حکمؐ

خالدؔ کی شاعری نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ انسان بڑی بڑی باتیں، بڑے بڑے مسائل مختصر طور پر اشعار میں مؤثر انداز سے ادا کر سکتا ہے۔ خالدؔ اپنی شاعری سے انتہائی عظمت کی جس طرح تشہیر کرتے ہیں وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان سوچے اس کے وجود کا مقصد کیا ہے۔ نازک سے نازک احساس ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔ اور اس کے لئے انہوں نے نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ تاریخ قوموں کی تعمیر میں بڑا اہم کام انجام دیتی ہے۔ اس لئے خالدؔ تاریخی واقعات اِس طرح اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں کہ ہم میں پلٹ کر دیکھنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی اس لئے نہیں ہے کہ اسے رو رو کر گزارا جائے یا اس لئے نہیں کہ پاگلوں کے سے انداز میں قہقہے لگائے جائیں۔ زندگی کا یہ مختصر سا عرصہ آلام دہر کو گلزار بنانے اور اپنی ہی شخصیت کی تکمیل کرنے کا موقعہ ہے۔ خالدؔ نے ہمیں سوچنے کا جو انداز دیا ہے وہ نہ صرف افادی ہے بلکہ تعمیری بھی ہے۔ جس انداز سے خالدؔ پوری قوم سے مخاطب ہوتا ہے اسے دیکھ کر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک سچے رہبر کی ساری خوبیاں موجود ہیں اور یہ عظمت اردو ادب کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ ان کی نظموں میں گہری ابلاغی کیفیت ہے۔ خالدؔ نے جدید اردو نظم میں ابہام سے ہٹ کر کام کی باتیں کی ہیں۔

اب تک ہوتا یہ رہا ہے کہ شاعر بڑے بڑے دعوے کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے لفظوں کے جو جادو جگائے ہیں ان میں اثر ہے لیکن یہ اثر دیر پا نہیں رہ پاتا۔ اس لئے کہ ہمارے

شاعر اپنی زندگی میں اپنے قولوں پر کاربند نہیں رہ پاتے۔ بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ قطعی غیر عملی ہوتے ہیں اور لاأبالی پن اُن کی فطرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز اثر تو کرتی ہے لیکن دل کی گہرائیوں میں نہیں اُتر پاتی۔

خالد کی شاعری کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ اتنے مختصر سے عرصے میں انہوں نے اتنا کچھ لکھ لیا ہے کہ لوگ عمر گزار کر بھی نہیں لکھ پاتے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ زُود نویسی سے ان کے ہاں سستا پن پیدا نہیں ہوتا۔ نہ موضوعات میں کمی آتی ہے۔ نہ ایک بات کے دُہرائے جانے کا احتمال ہوتا ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے مشاہدے اور تجربے گہرے ہیں اور علمی لحاظ سے ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں سے فیض حاصل کیا ہے اور اب بھی مطالعہ ان کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ اردو ادب کو ایسے شاعروں کی شدّت سے ضرورت ہے۔

مُلک کے مشہور و معروف چہرہ نگار شاہد احمد دہلوی مرحوم نے ان کی تصویر اس طرح کھینچی ہے —— "چہرہ کتابی، رنگ شہابی، کشادہ پیشانی شکنوں سے پاک، نِندا سی آنکھیں جو جاگتے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ ایسے بند کہ بقول شاعر: آپ کہیں کہ کوئی زخم تھا جو اچھا ہو گیا۔ بند ہوں تو غنچہ، کھلیں تو پھول، پُر عزم ٹھوڑی، ڈاڑھی مونچھیں صاف، میانہ قد، چلیں تو سرِ رواں، بیٹھیں تو کوہِ گراں، گفتگو گُل ریز، خموشی متکلم، دیر میں کھُلتے ہیں، مگر جب دل کی جوار کھُل جاتی ہے تو ان کی باتوں میں راگ کی سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ؏ پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار"

خالد خوش شکل خوش مزاج اور خوش گفتار تو ہیں لیکن جس انداز سے شاہد صاحب نے متعارف کرایا ہے وہ بے حد شاعرانہ اور اچھوتا انداز ہے۔ خالد کی شاعری بڑی سُلجھی ہوئی ہوتی ہے وہ خوا لوا لا، ڈینگیں نہیں مارتے اور نہ بات کو بے حد شاعرانہ انداز سے کہنے کے عادی ہیں۔ وہ ادب، سیاست، معاشرت، اخلاق اور مذہب ہر موضوع پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور موضوع تھا "انقلابی شاعری"۔ خالد نے انقلابی شاعری پر بڑی اچھی رائے کا اظہار

کیا۔ انقلاب، شاعری، ادب، سیاست، قومیت اور انقلابیت، غرض ہر چیز پر انہوں نے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں خالد کی صورت دیکھتا رہا۔ ہمارے ہاں "انقلابی شاعروں" نے انقلابی شاعری کو محض دھُواں دھار اور گھن گرج والے اشعار ہی سمجھ رکھا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر جو انقلاب کے معنی لیئے جاتے ہیں وہ بہت محدود ہیں، اشتراکی شاعر جب پیٹ پر ہاتھ مار مار کر اس بات کی تشہیر کرتے ہیں کہ روٹی اور کپڑا ہی سب کچھ ہے۔ بھوک خدا کا روپ ہے۔ اور ظلم و تشدّد سے۔ اخلاقی اقدار کو مٹا کر جو جی میں آئے کیا جائے، نعرے لگانا، ظلم و تشدّد کرنا، ہر تخریبی پہلو اختیار کرنا، اور خدا اور مذہب کو گالیاں دینا انقلابیت نہیں، ذاتی خودغرضی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں انقلاب کے مفہوم ہی دُوسرے لیئے جاتے ہیں یہاں میں اس بات سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ اشتراکیت نے اردو میں کس طرح کی شاعری پیدا کر دی ہے۔ میں نے خالد سے مل کر یہ محسوس کیا کہ ان کے دل میں سچی لگن ہے۔ کام کرنے کا سچا جذبہ ہے۔ ان کے ہاں میں نے قرآن پاک کو "ریفرنس بُک" کے طور پر استعمال ہوتے دیکھا۔ ہمارے ہاں عام طور پر وہ یا تو گلے میں لٹکانے کے کام آتا ہے، یا گھول کر پلانے کے۔ یا پھر اچھے سے جزدان میں لپیٹ کر گھر میں سب سے اونچی جگہ پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کام ان کی نظر میں قرآن کا ہو ہی نہیں سکتا۔ خالد بات بات پر قرآن کے حوالے دیتا ہے۔ وہ عاشقِ رسولؐ ہے وہ اس لیئے مسلمان نہیں ہے کہ وہ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام عبدالعزیز ہے۔ بلکہ وہ اس لیئے مسلمان ہے کہ اس نے خدا کی وحدانیت کو سمجھا ہے۔ خدا کے کلام کو نہ صرف سمجھا ہے بلکہ اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اور یہی ایک پیغام اس کے پاس ہے جس کو وہ اپنی شاعری کی معرفت تبلیغ کرتا ہے۔ شاہد صاحب خالد کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"خالد صاحب نے عربی کا تمام ادب چاٹ ڈالا۔ قرآن مجید اور بائبل کو بالاستیعاب پڑھا اساطیر الاوّلین اور دُنیا بھر کے علم الاصنام کو بھی کھنگال ڈالا۔ ایک تو کریلہ اوپر سے نیم چڑھا۔ یہ سارا علم ان کی شاعری کے قلب میں ڈھل گیا۔ لوگوں کو پہلے ہی اُن سے اُن کی مشکل پسندی اور دُشوار گوئی

کی شکایت تھی۔ اب جو یہ غضب ٹوٹا تو مالک رام جیسے عالم فاضل بھی پناہ مانگ گئے، ہما شما کا ذکر ہی کیا، خالد صاحب بھی چہ کنم میں پڑ گئے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل!"

خالد صاحب کی مشکل پسندی کے بارے میں ایک مزے دار لطیفہ مشہور ہے (اس کے راوی شاہد احمد دہلوی مرحوم ہیں) خالد کے ہاں چند ادیب دوست بیٹھے تھے، ابن انشا نے خالد صاحب سے کہا "آپ یہ تو مانیں گے کہ ہم لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، دانشور نہ سہی اوسط درجے میں تو ہمارا شمار ہوتا ہی ہے۔ جب ہماری سمجھ میں آپ کے شعر نہیں آتے تو کسی اور کی سمجھ میں کیا آئیں گے!" اس کا جواب خالد نے یہ دیا تھا کہ آپ مجھ سے کیوں کہتے ہیں کہ میں نیچے اتروں۔ آپ خود اپنے آپ کو اونچا کیوں نہیں کرتے۔" شاہد صاحب نے اس واقعے کو بڑے اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

"مرزا غالب کو بھی اپنے ہمعصروں سے یہی شکایت تھی کہ وہ اُن کا کلام سن کر ہنس دیتے تھے۔ آج دیکھئے مرزا کا کیا مقام ہے۔ خالد صاحب آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا چاہیے کہ آپ کا کلام آپ سے سمجھنے کے محتاج نہ رہیں بلکہ خود سمجھنے کے اہل ہو جائیں۔ مگر کیا ہم کبھی بھی اتنا علم و فضل حاصل کر سکیں گے جتنا آپ نے کر لیا ہے۔ شاعری کی شرطِ اوّل ابلاغ ہے۔ اگر ہم بھی آپ کے شعر کو نہ سمجھ سکیں تو گوئٹے اور جیمز جوائس کی طرح گنتی کے آدمی آپ کے مخاطب رہ جائیں گے۔ یا پھر یہ کیجیے کہ مرزا کی طرح آپ بھی اپنے خطوں میں بعض تلمیحی اشعار کی شرح کر دیجیے مگر اس میں مشکل یہ پیش آئے گی کہ اصل سے کئی گنی تلمیحوں کی توضیح ہو جائے گی۔"

خالد ہمارے اپنے عام معاشرے کی تصویر دیکھئے کس طرح پیش کرتا ہے ؎

جو بِل کی بیتے تھے نوکر ہوئے ہیں ہاں جی کے — جو ہاں میں ہاں نہ ملائے گنوائے اپنا بھرم
ہمہ انانیّت و مطلق العنانیّت — نشانِ صلیب کا گردن میں لب پہ ذکرِ صنم
زلیخے، مطلبی، بشنی، وِلاسی، رسیا، چھبیل — بدن پرست، ہوس باختہ، ذمیم، شمیم
بنا ہے شہ کا مصاحب ہر ایک بل بھکوا — بہ چشمِ جاہ، بہ اُمیدِ مشرب و مطعم
ادب کا حسن ممتنع ہے ملک بے ادباں — ہے کاروبارِ گلستاں حوالۂ اختم

شاعر کے لئے یہ لمحۂ فکر ہے۔ مایوسیاں اور نامرادیاں، شاعر کے ذہن میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ جن شعراء کے ہاں تعمیری پہلو نہیں ملتا۔ وہ معاشرے کی ایسی تصویر کھینچ کر پھر بھٹکنے لگتا ہے۔ خالد مایوس نہیں ہیں۔ وہ معاشرے کے ان رِستے ہوئے ناسوروں کا علاج سوچتے ہیں اور اصلاح کی خاطر خدا سے دُعا بھی کرتے ہیں ؎

ہے ہر نفس جَمَعَ اللہ شَملَھُم کی دعا — کہ افتراق سے قومیں بنیں سبک اُبھرم

یہی دُعا ہے الٰہی! بنام پاک نبیؐ — دیارِ پاک رہے دائماً خوش و خرّم

کافر اور مومن کی پہچان بتاتے ہیں ؎

تم جام در کف! ہم سُکر در سر — تم اہلِ صورت! ہم اہلِ معنیٰ

کافر کی جنّت مومن کا زنداں — یہ باغِ ہستی، یہ بزمِ دُنیا

خدا کے چاہنے والے خودداری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

نہ خواہش جاہ و منصب کی نہ لالچ مال و دولت کا ؛ خدا کا چاہنے والا بہت خوددار ہوتا ہے

اپنوں سے شکوہ کرتے ہیں ؎

دلِ آگاہ نہیں دیدۂ بیدار نہیں — کون اِس دیں کو کہتا ہے کہ نادار نہیں؟

یہ فرنگی کے غلامانِ رہا کردہ ہیں — ہیں بظاہر تو یہ آزاد پہ احرار نہیں

وطنِ پاک میں رُسوا ہے زبانِ اردو — ہے یگانوں سے گلہ شکوۂ اغیار نہیں

ہمارے ہاں اختلافِ رائے کو کچل دیا جاتا ہے۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس کی رائے میں کچھ صداقت بھی ہے۔ چنانچہ وہ جوہر جو اپنی نوعیّت سے اہم ہوتا ہے اُبھر نہیں پاتا۔ اور آزادیٔ رائے گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتی ہے ؎

اختلافِ رائے کو دیتے ہیں غدّاری کا نام — جوہر اُبھرے کس طرح فن کس طرح پھولے پھلے؟

خالد پر بہت کم لکھا گیا ہے حالانکہ خالد کی شاعری اس قدر پُرمعنی ہے کہ جی کی سیری نہیں ہوتی۔

؏ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی!

عاصی کرنالی

خالد کی قومی و ملّی شاعری

(" خروش خم " کے حوالے سے)

خالد اب شہرت و عظمت کے اُس مقام پر ہے اور اُس نے اِتنا لکھا ہے اور اُس پر اتنا لکھا گیا ہے، اور وہ اتنا لکھ رہا ہے اور اُس پر اتنا لکھا جا رہا ہے کہ اب اس کی فنی شخصیت کے سارے بھید ہمارے سامنے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دُور اندیش اُستاد کوئی نہ کوئی داؤ بچا کر رکھتا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ ویسے بھی انسانی ذہن کے ممکنات کی کوئی حد نہیں اور اس کے اسرارِ سر بستہ کتنے ہی آشکار ہو جائیں پھر بھی ذہن کی پہنائیوں اور بیکرانیوں میں ایسے ایسے نادیدہ اور محسوس نکردہ اسرار و رموز تہ در تہ اور تو بر تو پائے جاتے ہیں۔ کہ جن کا کشف ادراک کی توفیق و ترقی کے درجات کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذہنِ خالد کی پُر اسراریت کی کتنی تہیں ابھی عالمِ خفا میں ہیں۔ تاہم جہاں تک خالد کو سمجھا جا سکا ہے۔ وہاں تک خالد کے فن کے بہت سے خصائص و معارف ہمارے سامنے ہیں۔ اس مقام پر یہ اشارہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ شخصیات جب نقد و تبصرہ کی زد پر آتی ہیں تو مباحث کی ایک ہی جہت اور ایک ہی رُخ نہیں ہوتا، بلکہ مثبت اور منفی، موافق اور مخالف، قبول اور ردّ کی صُورتیں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ایک گروہ تحسین کے مقام پر اگر قبول کر لیتا ہے۔ دُوسرا گروہ تعریض کے مرحلے میں رُک کر مسترد کر دیتا ہے۔ بعض لوگ بین بین راستہ اختیار کرتے ہیں خالد کو جتنی حدّت کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔ اتنی ہی شدّت کے ساتھ اس کو منسوخ بھی کر دیا گیا۔ اور صلح کُل گروہ نے اس کی شخصیّت کے بعض اجزاء کو قبول کر لیا، بعض کو ترک کر دیا۔ زاویوں کا یہ اختلاف، نقد و بصر کی یہ تنوّع کاری، اعتراف و تنسیخ کے یہ گروہی محاکمے، ردّ و قبول کے یہ شخصی فیصلے، ان سب

میں ایک بات قدرِ مشترک ہے۔ اور وہ ہے خالد کی شخصیت کا وزن، اُس کی قوت، اس کا وجود، ذہنوں پر اس کا نزول، محسوسات پر اس کا نفوذ، اس کے ماننے والوں نے بھی اس کی گراں مایہ شخصیت کا اثر محسوس کیا۔ اور نہ ماننے والے بھی اس کی گراں باری سے دوشِ احساس کو فارغ نہ کر سکے۔

اصل میں اُس نے تجربہ ہی ایسا کر ڈالا کہ تلاطم کیا، طوفان آگیا۔ بحرِ ساکن کی سطح کیا تہیں بھی اُلٹ پلٹ ہو گئیں۔ ایسا انوکھا، منفرد، اچھوتا اور اَن چھوا تجربہ جس سے ادبِ اردو کی صدیوں کی صدیاں تہی دامن تھیں۔ اُس نے ادب کو سوچ اور اظہار کے اعتبار سے "محدودیت" سے نجات دی۔ ایک چھوٹے سے، تنگ سے، بیضہ مور جیسے کینوس کی بجائے آسمان جیسے وسیع کینوس پر نقش و رنگ کے معجزاتِ ہنر سجائے۔ اس تجربے کی معنویت پر جتنا غور کیجئے مفاہیم کے دروازے کھلتے، اور مطالب کے طلسمی عجائب خانے نظروں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں۔ خالد نے زبان کے دائرے کو وسیع کیا۔ اتنا وسیع کہ اس میں کائنات بھر کی تہذیبیں، زبانیں اپنی تمام توانا روایتوں اور احیائی ممکنات کے ساتھ سمٹ آئیں۔ زبانوں کے جلو میں خالد نے اساطیر، تلمیحات، واقعات و قصص، تشبیہہ و استعارہ، یعنی ماضی کے تمام صالح اور حیات پذیر عناصر کے جلوس اپنے جادۂ فکر و ادب پر لا کھڑے کیے۔ اور پھر تجربہ کے سفر کو اس طرح منزل آشنا کیا کہ ماضی کی روایات کو عصری مقتضیات سے مربوط کر دیا۔ اس طرح جہاں خالد نے ماضی کی گم گشتہ اور پس رفتہ ادبی، تہذیبی، فکری اور ذہنی کائنات کو حیاتِ نو بخشی اور اسے نشاۃِ ثانیہ کے ہنگامہ زار کا حصہ بنایا۔ وہیں عصرِ حاضر کی روح کو بھی فکری قالب بخشے۔ اور اس طرح ایک سانس لیتی، جیتی جاگتی، پلکیں جھپکاتی، دیکھتی، بولتی، چکتی اور چہکتی مخلوق کو پردۂ الفاظ و اظہار سے باہر نکالا اور اہلِ نظر کے سامنے لا کھڑا کیا۔

جذبے سے لے کر لہجے تک خالد کی شاعری میں زندگی ہی زندگی ہے۔ اس کا ہر جذبہ قاری سے باتیں کرتا اور اپنی معنویت آشکار کرتا نظر آتا ہے اور اس کا ہر لہجہ اپنے اسرار و معارف اہلِ بصیرت پر منکشف کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کے اوراقِ شعر پر آنکھیں جمائیں تو الفاظ میں زندگی کی

جنبش نظر آتی ہے اور اگر اُس کے صفحاتِ ادب پر کان لگائیں تو اس کے جذبوں کی دھڑکن صاف سُنائی دیتی ہے۔

وہ جب لکھتا ہوگا یعنی جب اس کا ذہن آسمان سے ادبی الہامات وصُول کر کے کاغذی ارضِ منتظر پر نازل کرتا ہوگا اُس وقت بہت سی زبانیں، بہت سے علوم، بہت سے الفاظ و اصطلاحات بہت سے رموز اور کنائے، بہت سے اظہارات اور پیرائے، بہت کچھ، سب کچھ اس کے روبرو دست بستہ اس کے حکم کے منتظر ہوتے ہوں گے۔ تب کائناتِ شعر میں اس کی خلاّقیت "کُن" کہتی ہوگی۔ اور اس لمحے ہر شئے "فَیَکُون" کی منزل پر جلوہ گر ہوجاتی ہوگی۔ یہ خیال مجھے اُس کے جذبے کی جوانی اور اس کے لہجے کی روانی دیکھ کر پیدا ہوا۔ نہیں معلوم یہ کیا بات ہے۔ کہ جب میں اس کی کوئی کتاب کھولتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے مجھے کسی نے دھکا دے کر تیز رفتار، پُرجوش اور تند موج سمندر میں گرا دیا ہے۔ اور اب میں اس پُرجلال سمندر کے رحم و کرم پر ہوں۔ پُر ہیبت اور جلالت مآب لہروں کے ہاتھ مجھے اُچھالتے پھرتے ہیں، پھر کوئی بہت دراز دست موج مجھے کنارے کی طرف پھینک دیتی ہے۔ میں اپنی جان بچا کر اپنے گھر کی طرف لوٹ جاتا ہوں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اگلے دن میں پھر کنارے پر کھڑا ہوتا ہوں۔ اور ایک توانا خواہش میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش آج بھی کوئی مجھے دھکا دے دے اور اس جلیل و عظیم سمندر میں پھینک دے۔

تو یہ اُس کے تجربے کا انوکھا پن اور انفرادیت ہے۔ اس کی رندانہ جرأت بلکہ اُس کا سرفروشانہ جہاد ہے۔ اُس نے شاعری کو ایک نئی آواز دی ہے۔ ایک نیا اسلوب اور لہجہ دیا ہے۔ ایک نیا اُفق اور بلندی عطا کی ہے۔ پھر یوں بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس نے معلومات کے اس تنوّع کو، جو الگ الگ، متفرق، منتشر اور متضاد اجزاء کی یکجائی سے اُبھرا ہے۔ ایک معنوی ربط دیا ہے۔ خالد ملّتِ اسلام کا مفکر اور شاعر ہے۔ اُس نے اسی ملّت کے احیاء اور فروغ کا مشن شروع کیا ہے۔ وہ اپنی ملّت کو ایک تشخص دینا چاہتا ہے جو اسے ماضی میں حاصل تھا۔ وہ اپنی ملّت کے ذہن و فکر کی اُن کڑیوں کو مرتّب کرنا چاہتا ہے جنہیں آشوبِ زمانہ نے بکھیر دیا۔ وہ اپنی ملّت کو حکمت، آگہی اور روشنی دینا

چاہتا ہے، جو اس کا مالِ گم شدہ ہے۔ اور جس کے بغیر وہ تہی کیسہ اور نادار ہو گئی تھی۔ وہ مختلف تہذیبوں کے صالح، مثبت اور زندہ عناصر کا کھوج لگا کر انہیں ملّت کی حیاتِ نو کی تعمیر میں صرف کر رہا ہے۔ اس کی شاعری کا تمام تر مزاج اسلامی ہے۔ وہ ملّتِ اسلام کے فکر و نظر کے بجھے ہوئے چراغوں کو فروزاں کر رہا ہے۔ وہ تمام مثبت افکار و ادبیات کا روغن کشید کر کے ان چراغوں کی تہ میں بھر دیتا ہے تاکہ یہ جلتے رہیں۔ اور ان سے آنے والے دہور و اعصار کو روشنی پہنچے خالد کے اسلوب میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ادراک کے لئے خود قاری کا اپنا علمی پس منظر اور فکری BASE ہونی چاہئے۔

وہ زمین کی باتیں کرتا ہے مگر وہ زمین سے اونچائی پر کرسی بچھائے بیٹھا ہے۔ وہ اس کرسی سے اُتر کر، نیچے کی طرف آکر قاری کی سطح پر بات نہیں کرے گا۔ قاری کو اس کی سطح پر پہنچ کر اُس کی بات سننی پڑے گی۔ اُس نے زمین اور اپنی کرسی کے درمیان زینہ بچھا دیا ہے اور یہ زینہ توفیقِ ہمّت سے طے ہوتا ہے۔ بس ساری گڑبڑ اسی قصّے میں ہے۔ وہ اپنی علمی سطح سے ایک انچ نیچے آنے کو تیار نہیں۔ اب قاری کی علمی سطح کا مسئلہ ہے کہ وہ کتنی بلند ہے۔ میرے خیال میں خالد کے ردّ و قبول کا اصل مسئلہ یہی سطح کا مسئلہ ہے۔

اب "خروشِ خم" کی بات کرنے کا صحیح محل موقعہ آگیا ہے۔ خالد کا یہ نظمی مجموعہ قومی ملّی وطنی اور رثائی منظومات پر مشتمل ہے۔ شروع میں پانچ نظمیں وطنی احساسات و جذبات سے مملو ہیں۔ ان کا لہجہ رومانی ہے اور زیادہ تر وطن کے جمالِ صورت اور جمالِ سیرت کی بات کی گئی ہے پہلی دو نظموں "اے دیارِ پاک" اور "اے وطنِ پاک" میں رومانی رویہ زیادہ واضح اور زیادہ مسلسل ہے دیارِ پاک، روکشِ خلدِ بریں ہے، اس کا ذرہ ذرہ مطلعِ مہر مبیں ہے۔ ریگستان فرشِ پرنیاں ہیں اور کوہستان کانِ گوہر ہیں۔ اسی طرح دوسری نظم وطنِ پاک میں خاکِ سیہ، عنبرِ سارا ہے۔ یہاں خرمنِ مہتاب اور خیابانِ گل کا ہجوم ہے۔

پہلی نظم میں رومانیت بہت جلد وطن کے جیالے سپوتوں کی توصیف میں بدل جاتی ہے۔

اور مقصدی دبتی، رنگ اختیار کر لیتی ہے جبکہ دوسری نظم میں رومانیت کی لہر شروع سے آخر تک قائم ہے، بلکہ مکان کی مدحِ جمال سے بات پھسل کر مکینوں کے قصیدۂ حسن و شباب تک آ پہنچی ہے اور اس طرح نظم زیادہ دلکش، شوخ، خوش رنگ اور توانا ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات میں جزئیات نگاری اور بکھرے ہوئے اجزائے جمال کی شیرازہ بندی نظم میں زیادہ تاثر اور اپیل پیدا کرتی ہے۔

گندمی پنڈے میں اپٹنے کی باس
نرگسِ شہلا میں مئے احمریں
پچھلے کو چکی کی گھر رگھوں کے ساتھ
ہونٹوں پہ اک زمزمۂ آتشیں!
ریشمی لاچے ہیں پھسل جاتے ہیں
حسنِ زلیخا نہیں پردہ نشیں!

دونوں نظموں میں ایک ہی تار شمار کے قافیے ہیں۔ بحروں میں بھی نازک سا فرق ہے۔ اس سے کہیں کہیں تکرارِ خیال ہو گئی ہے۔ اور مضامین میں خال خال اتحادِ معانی کا احساس ہوتا ہے۔ دونوں نظموں میں ایک قدرِ مشترک کشمیر کا ذکر ہے۔ اس کی پابہ زنجیری کا رقت آفریں ذکر اور اس کی آزادی کی روشن امید ؎

وادیٔ کشمیر تو کیوں ہے اداس
چاہنے والے تجھے بھولے نہیں

تیسری نظم "سرزمینِ پاک" مختصر سی نظم ہے اور اس کے مضامین و مطالب پہلی دو نظموں میں آگئے ہیں۔ اس لئے یہ نظم اس جذبے کی رو کو کوئی خاص آگے نہیں بڑھاتی۔

چوتھی نظم "اے ارضِ زندہ دلاں" کی بحر شگفتہ اور رواں اور متموّج ہے۔ اس لئے نظم کی کشتی بہتی اور تیرتی چلی جاتی ہے۔ اس میں "حب الوطن من الایمان" کی حدیث کو اساس بنا کر محبانِ

وطن کے عزم و ہمت کو سلام کیا ہے اور وطن کے نگہبانوں کی فرض شناسی کا اعتراف بہت ہی خوبصورت
اور گمبھیر لہجے میں کیا ہے۔ کہیں کہیں مصرعوں کے نصف میں عربی کے ٹکڑے نظم کے حسن میں اضافہ کرتے
ہیں۔ جہاں جہاں دعائیہ انداز ہے۔ وہاں وہاں دل کا خلوص سیّال ہو کر لفظوں کو نم آلود کر رہا ہے
ایسے اشعار ایک عجب بھیگی ہوئی کیفیت میں لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہمیشہ یوں ہی بہاریں شباب کی لوٹیں
ترے نگار، ترے گلعذار، تیرے جواں
مہکتے کھلتے چٹکتے رہیں ہمیشہ یونہی
ترے گلاب، ترے ارغواں، تری کلیاں

اگلی نظم "یہی ہے میرا وطن" میں شاعر کی TUNE بدلی ہے۔ اور توصیف کی بجائے تنقید کا رنگ پیدا
ہوا ہے، یا یوں کہیے کہ بات گدگدی کرنے سے چلی تھی چٹکی لینے تک آ پہنچی۔ ایسی چٹکی جو جسم کی سطح
پر ناخن کا لہو رنگ نشان چھوڑ جاتی ہے۔ اس نظم میں جذبے کی جگہ تفکّر نے اور وصف نگاری کی
جگہ احتساب نے لے لی ہے۔

ہے زخم زخم بدن جس کا میرے دل کی طرح
جو مضمحل ہے مرے شوقِ منفعل کی طرح
ہے کش مکش میں کسی مردِ پا بہ گل کی طرح
یہی ہے میرا وطن، کیا یہی ہے میرا وطن

ان نظموں کے بعد چند نظمیں وطن کے مجاہدوں، شہیدوں، اور جنگی قیدیوں کی قید اور رہائی
کے بارے میں ہیں۔ رجز، اے مجاہد، اے سربکف مجاہد، اے موت کے ہمراز و، بآں گروہ،
انتساب پروازِ عقاب کا، حرفِ تشکّر، کرو حمد خدائے نادیدہ، اسی قبیل اور مزاج کی نظمیں ہیں۔
ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنے آپ کو اس قافلۂ اربابِ وفا اور اس گروہِ جاں سپاراں
سے الگ نہیں سمجھتا، ان کے دل کی دھڑکنیں، اُن کے جذبے، اُن کے دُکھ، اُن کے سُکھ، شاعر کے

اپنے وجود اور ذہن اور دل سے ہم آہنگ ہیں۔ اسی لئے ان نظموں میں قلبی محسوسات کا رنگ اور اپنی ذات کی خوشبو پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نظمیں احساسِ فخر و تمکین سے لبریز ہیں۔ مجاہدوں کی اسیری پر خالد کے دل کے لہو کی ایک لہر ؎

افق کے پار مسافر ہیں جو نہیں لوٹے
نہ جانے قافلۂ رفتگاں کب آئے گا

⁂

وطن سے دور، وطن کے وہ سادہ لوح سفیر
عناں گسیختہ و سرفراز و سینہ سپر
تھا زورِ بازوئے سمسون جن کا زادِ سفر
وہ شیر نر کی اجل، مرگِ فیلِ بے زنجیر
پلنگِ بیشہ سے بڑھ کر تنگ آور و طنّاز
اور آسماں کے عقابوں سے بھی سبک پرواز
مقید ان کو کیا آہنی سلاخوں نے
بندھے ہیں ایسے کہ باہر نکل نہیں سکتے
نکلتی ہے رگِ جاں سے گھٹی گھٹی آواز
وہ ٹاٹ اوڑھتے ہیں، سر پہ خاک ڈالتے ہیں
ستارا اُن کے ٹنگے بانس کے درختوں پر
حیات سوختگاں، حیف و حسرت و ارماں
فغانِ نیم شب و نالۂ سحرگاہاں

⁂
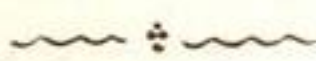
اسیرانِ وطن کی رہائی پر اہتزاز و مسرّت کی ایک موج ؎

زمیں ارغواں، آئنہ پوش ہے آسماں

کہ دشتِ ہویدا سے لوٹے ہمارے جواں

حزیں قمریوں کی طرح دخترانِ وطن

رہیں جن کے غم میں نوا سنجِ آہ و فغاں

ہواؤں کے ہونٹوں پہ ہیں خیر مقدم کے گیت

درختوں کی شاخیں بجاتی ہیں شہنائیاں

"ہم حزبِ محمدؐ ہیں" ایک فخریہ نظم ہے جو رجز کی سی گونج گرج کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں ایسا اسلوب (جس میں خاص لفظوں کے چناؤ اور در و بست سے شکوہ و جلال کی فضا پیدا کی گئی ہے) برتا گیا ہے۔ موضوع کی نوعیت، خیال کا ترفع، اسلوب کا جلال اور مقصد کا رچاؤ۔ ان اجزا نے نظم کو شعلوں اور بجلیوں سے بھر دیا ہے۔ اسے قومی نغمے کے طور پر رواج اور قبولِ عام حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک بند ؎

ہم خرمنِ باطل کے لیے برقِ تپاں ہیں

ہم شیرِ ژیاں، سیلِ رواں، کوہِ گراں ہیں

بُت خانۂ ایّام میں گلبانگِ اذاں ہیں

مردانِ خدا کے لیے پیغامِ محبّت

ابلیس کی اُمّت کے لیے قہرِ الٰہی

ہم حزبِ محمدؐ ہیں، ہم اللہ کے سپاہی

"سیل العرم" اور "اذا زلزلت الارض" حادثاتی موضوع پر دو نظمیں ہیں جن میں سیلاب اور زلزلے کی تباہیوں کا ذکر، اہلِ وطن کے دل میں حوصلہ انگیزی کے جذبات، اور خدا سے اس کے فضل و کرم کی التجا کے مؤثر اور دلگداز مضامین پائے جاتے ہیں۔

"جی میں آتا ہے فلسطین چلیں" خالد کی زندہ اور تابندہ شعری کاوشوں میں سے ایک ہے

جو تخلیقات اپنے خالق کی زندگی بلکہ ابدیت کی ضامن ہوا کرتی ہیں۔ میں اس نظم کو ان میں شامل سمجھتا ہوں۔ اس نظم میں دل اور ذہن کا وہ کرب شامل ہے جس کی لہر کا ایک سرا خالد کے وجود میں پیوست ہے اور دوسرا سرا عالمگیر اسلامی اخوت کے اجتماعی وجود سے بندھا ہوا ہے۔ "فلسطین" کے موضوع پر نظم ہے۔ اس لیے بنی اسرائیلی روایات واساطیر، تاریخی حقائق و معارف، تلمیحی اور اصطلاحی رموز و تصریحات، قوموں کے تہذیبی خصائص وغیرہ کے رنگوں سے شعری کینوس پر بڑے تیکھے اور گہرے اور انمٹ نقوش ابھارے ہیں ؎

جی میں آتا ہے فلسطین چلیں
طورِ سینین چلیں
باندھ کر رختِ سفر وادیٔ والتّین چلیں
ارضِ زیتون کو دیکھیں کریں نظارۂ قدس
ہو نہ دُوری سے دلِ زار کی تسکین، چلیں!
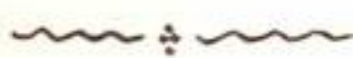
~~~ ٭ ~~~

اے جوانانِ جنود
ہے یہ ہنگامِ نمود
پھر صف آرا ہیں یہود
ہے بپا معرکۂ بود و نبود
قصدِ سینا کا کریں، جانبِ صفّین چلیں
صف بہ صف حزبِ محمدؐ کے اراکین چلیں

~~~ ٭ ~~~

رنگ فق دُخترِ صیّون کی زیبائی کا
(دیدہ ہے مارا اسے نعمٰی نہ کہو)

پیرہن تنگ بدن خجلت و رسوائی کا

سرِ عام اس کو یہود اہ کرے بے پردہ

متقابل نہیں ہر چند مقابل میرے

ہوں گے ناپید سدوم اور عمورہ کی طرح

کیا انہیں چھوڑ گئے سامری و گوسالہ

نظم میں علمی اسلوب کے باوجود جذبے کی ایسی آنچ ہے، کہ پڑھنے والوں کے دل سینے میں پگھل جاتے ہیں اور نظم ایسا بھرپور تاثر چھوڑتی ہے جو ہرگز کم نہیں ہوتا۔

وطنیہ اور ملّی نظموں میں ایک بات مشترک ہے کہ عموماً اُن کا نصف آخر یا ان کا تتمہ خدا کی مناجات اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذکر پر منتج ہوتا ہے۔ خالد اپنا سارا آشوبِ دل، اپنے درد کی ایک ایک ٹیس، اپنے وطن کے تمام آلام و مصائب، خدا اور اس کے رسُول کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے، اور ان کے فضل و کرم کی آس پر ایسے مضامین کو ختم کرتا ہے، یہی نہیں کہ دُکھ میں اُن سے استمداد ہے، بلکہ خوشی اور مسرّت کے لمحات میں زبانِ نیاز پہ کلماتِ شکر ہیں، فخر و مباہات کے عالم میں نصُرت و توفیقِ الٰہی اور رحمتِ رسُولِ پاکؐ کا اعتراف ہے۔ چند مثالیں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اے دیارِ پاک

اے خدائے جنّ و انس و عرش و فرش

ربّ افواجِ سماوات و زمیں

کون پاکستان کا تیرے سوا

حامی و ناصر، مددگار و معیں

ہم تری تائید کے محتاج ہیں
ہم غلامانِ رسُولِ آخریں

~~~ ❁ ~~~

باآں گردہ

تو خاکِ مُردہ کو کرتا ہے عمرِ تازہ عطا
شکست و ریخت کی اس بہاں کنی سے ہم کو بچا

- - — - -

عدو سے ان کو چھڑا اے یگانہ و یکتا
نہ کر مزید ہمیں زیرِ آسماں رُسوا

- - - - -

تو منتقم، تو مہیمن، تو مقتدر، تو صبُور
مقدّم و متعالی، علیؔ و عدل و غفُور
ولیؔ و والی و واسع، نصیر و ناصر و نُور

~~~ ❁ ~~~

حرفِ تشکّر

دُعا ہم نے کی اُس سے اپنی مصیبت کے دن
بنامِ گرامی مایۂ خواجۂ خواجگاں
وہ خواجہ جسے مقصدِ خلقِ آدم کہیں
جو ہے مہترِ مہتراں، بہترِ بہتراں

~~~ ❁ ~~~

دردِ حمدِ خدائے نادیدہ
~~~

مصطفےٰ پر پڑھو صلوٰۃ و درود

کرو حمدِ خدائے نادیدہ

آگئے انتظار تھا جن کا

~~~ ٭ ~~~

فلسطین چلیں

دل مناجات سے لبریز ہیں، سینے پُر درد

جی میں آتا ہے فلسطین چلیں

طُورِ سینین چلیں

باندھ کر رختِ سفر وادیٔ والتّین چلیں

~~~ ٭ ~~~

اس حصّے میں ایک نظم "رحمۃ اللعالمینؐ" ہے۔ یہ بھی وطنی اور ملّی مزاج کی نظم ہے۔ اس کا اسلوب درد انگیز ہے اور حرف حرف سوز و گداز اور عقیدت و ارادت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وطن کی زبوں حالی، بے برگ و نوائی، انتشار و انحطاط، افسردہ خاطری، پژمردگی، آشوبِ حالات، کربِ مسائل اور تقدیرِ وطن کے سنوارنے کی التجا کے مضامین جس خوبی اور مہارت سے ادا ہوئے ــــ یہ خالدؔ ہی کا حصّہ اور اُسی کا شرف و اختصاص ہے۔ ایسی بحر کا چناؤ جو حزنیہ خیالات کے اظہار کے لئے موزوں ہو اور جس میں فریاد و اشک کی ساری کیفیتیں جذب ہو جانے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس کے علاوہ قلبی واردات اور وطنی آلام و مسائل کے امتزاج سے تخلیق پائے ہوئے اشعار ــــ ان تمام محاسن نے نظم میں یہ سحر پیدا کر دیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک دل شکستہ اور جگر خوں شدہ فریادی سرکارِ پاک کی جالی تھام کر فریاد کر رہا ہے ؎

اے کالی کملی والے تیرے آستاں پر آئے ہیں

ساتھ اپنے آہوں، آنسوؤں زخموں کے تحفے لائے ہیں
اک ملتِ واحد ہیں کافر قہرمانی طاقتیں
تیرے سوا حالِ دلِ آفت زدہ کس سے کہیں
آہوں سے دم گھٹتا ہے سینے میں خدایا کیا کریں
ڈر ہے مبادا ضبطِ گریہ سے کلیجے پھٹ پڑیں
مرنے کی کیا صورت نکالیں، کس طرح زندہ رہیں

~~~ ❊ ~~~

"خروشِ خم" میں تین نظمیں اسلامی سربراہی کانفرنس سے متعلق ہیں جن میں مہمانانِ معظم کو خوش آمدید کہا ہے اور اُن کے اجتماع سے ایک روشن تر مستقبل اور ملتِ اسلام کے فروغ و سرفرازی کی توقعات وابستہ کی ہیں ؎

تم قدم رنجہ کرو، ہم فرشِ پا انداز ہیں
جانِ ما، جانِ شما، اہلاً و سہلاً مرحبا
عمر بھر جو خواب دیکھا حضرتِ اقبالؔ نے
ہے اُسی کی اِک جھلک القمۃ الاسلامیہ

~~~ ❊ ~~~

ہم اپنے صاحبِ اقبال میہمانوں کو
سلام کرتے ہیں، خوش آمدید کہتے ہیں
تمام روئے زمیں مسجدِ مسلماں ہے
ہمارے دوست ہمارے دلوں میں رہتے ہیں

~~~ ❊ ~~~

یہ نظمیں افکار و جذبات سے لبریز ہیں اور پاکستان کے ذہن و مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتی
~~~
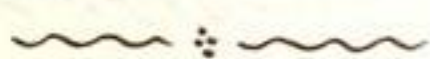
ان نظموں سے مترشح ہے کہ اسلام کسی ایک خطّے میں محدود نہیں، بلکہ تمام "اُمتِ محمدیہ" ایک ملّتِ واحدہ ہے۔ اور سب کے احوال و مسائل ایک ہیں۔ فکر و عمل اور ذہن و مزاج کی وحدت اس ملّت کے بنیادی خصائص ہیں ہے۔ یہ نظمیں اس تصوّر کا مکمل مظہر ہیں۔

آخری حصّہ رثائی منظومات پر مشتمل ہے جس میں ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیارپوری، یوسف ظفر، مختار صدیقی، سراج الدین ظفر، پروفیسر حمید احمد خاں، آغا شورش کاشمیری، مجید امجد، عبدالرحمٰن چغتائی، حالی، اقبال، سلطان شہیدؒ، عمر فاروقؓ اور مسجدِ اقصیٰ کے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ مرنے والوں میں بعض شخصیات خالد کے احباب ہیں۔ اُن کے اُٹھ جانے سے جو ایک خلا کا احساس ہوتا ہے وہ ان نظموں سے جھلکتا ہے۔ ان لوگوں کا مرنا، مروّت و وفاداری کی موت بھی ہے اور ملّی اور ادبی زندگی کا زیاں بھی۔ یہ ذاتی کرب اور یہ اجتماعی زیاں، دونوں کیفیتیں ایسی نظموں سے بخوبی آشکار ہوتی ہیں۔

"اے شاعر" کے عنوان سے جو اجتماعی مرثیہ کہا گیا ہے اس کا پہلا شعر، شاعر کے دل کی بے تاب دھڑکنوں، اس کے ذہنی کرب و اذیّت، اور محرومی اور نارسائی کا کتنا بڑا مظہر ہے ؎

تو دشتِ درد میں کیا ڈھونڈتا ہے اے شاعر
نشانِ گم شدگاں؟ نقشِ پائے راہرواں؟

آغا شورش کے بارے میں یہ شعر ؎

کچھ کے دینی ہیں یادیں تو ہوک اُٹھتی ہے
یہ کس یگانے نے کی شامِ دوستاں ویراں

مجید امجد کے بارے میں یہ اوّلیں مصرع ؏

مسافرِ شبِ رفتہ کو میں کہاں ڈھونڈوں

عبدالرحمٰن چغتائی کے بارے میں اس مصرعے کا بار بار اعادہ ؏

وداعِ رنگ کا منظر کسی نے دیکھا ہے؟

اِن شعروں کی کرب ناکی سے پوری نظموں کی المناک فضا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ نظمیں مرثیئے کے اجزا سے پُر ہیں۔ لیکن ان میں صبر و شکر اور تسلیم و رضا کے مضامین بھی ہیں۔ یہ اپنے فنّی اور معنوی محاسن کے اعتبار سے اور دل پر گزرنے والے آشوبِ غم کے بھرپور ابلاغ کی صُورت میں مکمل نظمیں ہیں۔

لیکن ایک نظم "اے کراچی کی ہوائے سوگوار" تاثیر اور دل گداختگی کے اس مقام پر ہے کہ اسے پڑھتے پڑھتے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ شاید ایسی نظمیں ایسے عالم میں لکھی جاتی ہیں جب آسمان کے سارے دروازے کھُلے ہوتے ہیں اور قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔ شروع میں کراچی کی اجتماعی فضا کا ذکر، پھر یہ تمام خارجی کائنات سمٹ کر شاعر کی داخلی حسّیات بن جاتی ہے۔ اور زمین کے وسیع رومان کی جڑوں سے دل کے رومان کا اکھوا پھوٹتا ہے۔ خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر کرتی ہوئی یہ نظم، اور پھیلی ہوئی حسرتوں اور محرومیوں سے ایک خاص حسرت اور محرومی کے دائرے میں سمٹتی ہوئی یہ نظم دل کے لہو سے لکھی گئی ہے، اسی لئے اس کی تاثیر یہ ہے کہ پڑھنے والے کا دل لہولہان کر دیتی ہے۔ مختلف کیفیّتوں کے دو ٹکڑے :۔

وہ سنہرا دیس، وہ گم گشتہ خوابوں کا دیار
غازۂ رُخسارِ گُل ہے جس کی راہوں کا غبار
وادیٔ مہران کے گیسو ہیں جس سے تابدار
وہ نواحِ مرو شانِ بادہ خوار و مے گسار
وہ سوادِ دوستانِ دل نواز و بُردبار

~~~ ٭ ~~~

وہ کہ جس کا قامتِ موزوں تھا سروِ جوئبار
جس کشیدہ قد کا خلعت تھا لباسِ انکسار
کھیلتی تھی جس کے چہرے پر تبسّم کی بہار
~~~

جو مرا کرتا تھا اپنے خیر خواہوں میں شمار
مجھ کو داتا کا نگر، اس کو ملا دار القرار
میں یہاں گلبرگ میں، برزخ میں وہ گردوں وقار
زندگی کا مجھ کو نشہ، اُس کو جنّت کا خمار
اے کراچی کی ہوائے سوگوار
تُو نے دیکھا ہے مری زندہ محبّت کا مزار

*

میں "خروشِ خم" کے بارے میں آخر میں صرف ایک فقرہ کہوں گا کہ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسے خالد نے لکھا ہے اور خالد جس نقش کو اُبھارتا ہے اُس میں خونِ جگر کے قطرے ٹپکا دیتا ہے۔ اس لیے وہ نقش، نقشِ دوام بن جاتا ہے۔ "خروشِ خم" بھی ایسا ہی ایک خوں زاد نقش ہے!

خالد بزمی

خالد کی آسان شاعری

غالب نے جب اس قسم کے اشعار کہے کہ

شمارِ سُبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اور ؎

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
وغیرہ

تو حکیم آغا جان عیش نے ایک مشاعرے میں تنگ آ کر کہہ دیا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دُوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

پہلے تو مرزا غالب مرحوم نے اپنے اس قسم کے معترضین کو "جاہل" قرار دے کر ڈانٹ دیا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل!
سُن سُن کے ملول ہوتے ہیں "جاہل"
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل!

لیکن جب اُن کی مشکل پسندی کے خلاف آوازوں میں اضافہ ہو گیا اور مرزا کو معلوم ہو گیا، کہ آساں کہنے کی فرمائش کرنے والے صرف "جاہل" نہیں بلکہ ان میں بڑے بڑے سخن شناس بھی شامل ہیں تو مرزا نے اپنی مذکورہ بالا رباعی کے دُوسرے مصرعے میں ترمیم کر لی اور اس رباعی کی یہ صُورت ہو گئی کہ ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل!
سُن سُن کے اُسے "سخنورانِ کامل"
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل!

غالب جن لوگوں کو کچھ ہی دیر پہلے "جاہل" قرار دے چکے تھے۔ اب وہ اُنہیں "سخنورانِ کامل" تسلیم کرنے پر مجبُور ہو گئے۔ اردُو شاعری کے لئے یہ شگون نہایت مبارک تھا۔

اس کے بعد غالب نے جو کہا اُس کا بیشتر حصّہ دماغوں کے راستوں سے دل میں اُتر گیا، اور غالب پہ مشکل پسندی کا جو الزام تھا وہ کسی حد تک دُور ہو گیا۔

اردُو شاعری میں غالب کے بعد عبد العزیز خالد دوسرا شاعر ہے جس کی شاعری کو مشکل قرار دیا گیا۔ اور اس طرح خالد پر بھی مشکل گوئی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔

لاہور میں عبد العزیز خالد کی تازہ ترین کتاب "پروازِ عقاب" کی تقریبِ تعارف کا انعقاد ہو رہا تھا۔ اس کتاب میں خالد نے شمالی ویت نام کے صدر ہوچی منہ کی نظموں کا اردُو ترجمہ کیا ہے۔ اس موقعے پر اردُو کے معروف طنزیہ اور مزاحیہ شاعر ضمیر جعفری نے خالد کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہوچی منہ کی نظموں کے بعد اب عبد العزیز خالد کو اپنی نظموں کا بھی ترجمہ کر دینا چاہیے۔

اگر آپ کو مجموعی طور پر خالد کی مشکل گوئی کا اندازہ نہیں تو مثال کے طور پر صرف حسبِ ذیل اشعار پر ایک نظر ڈال لیجیے ؎

ہیں آنسو شفائے دلِ مبتلا   رسُولِ سلام و سفیرِ سکون

ہیں عشاقِ سرمست کو ایکساں ۔ غیاب و حضور و بروز و کموُن

تب و تاب و تمکین و فقر و غنا ۔ خروش و خشوع و ہراس و ہدُون

نظر چیر جائے حجابات کو ۔ ہٹے فرق و فصلِ ظہور و بطوُن

ینابیعِ حکمت، مصابیحِ علم ۔ شناسندۂ کیفیات و شئوُن

خرد خواہشوں کی غلامی کرے ۔ کہاں ہے دلِ مطمئن و طموُن

جہالت چھپر کھٹ پہ سرمستِ ناز ۔ اور ادراک و افکار رہنِ شجوُن

ہو کیوں بحر و بر میں نہ ظاہر فساد ۔ ہیں ہم قافلہ جنگ و جوع و جنوُن

(مزمورِ میر مغنّی - پہلا حصّہ)

یہ اشعار پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ میں نے اس انتخاب میں وہ اشعار شامل نہیں کئے جن کا ایک ایک مصرعہ اور کہیں کہیں دونوں مصرعے خالصتاً عربی زبان میں ہیں۔

عبد العزیز خالدؔ کی مشکل گوئی کا اندازہ کرنے کے بعد آپ کو یہ معلوم کر کے یقیناً مسرت ہوگی کہ گزشتہ دو تین برس میں مختلف اخبارات و رسائل میں خالدؔ کے قلم سے جو منظومات منظرِ عام پر آئی ہیں ان کا بیشتر حصہ مشکل پسندی کے الزام سے پاک ہے۔ ابھی چند ماہ پیشتر ماہنامہ "نیرنگِ خیال" راولپنڈی کے ایک شمارے میں اُن کی ایک غزل دیکھنے میں آئی۔ یہ غزل پڑھ کر میرا خیال ہے ان کا انداز کچھ کچھ راہِ اعتدال پر آرہا ہے۔ وہ غزل آپ بھی دیکھیے:۔

زیست کو مغتنم سمجھ غافل ۔ تازیانہ ہے دُوریٔ منزل

کہے پیاسا سراب کو دریا ۔ عشق دُشوار ہے، وفا مشکل

تم سے نفرت بھی ہے محبّت بھی ۔ کوئی سمجھا نہ سمجھے منطقِ دل

چمک آئے نہ رو شنائی میں ۔ جب تک اس میں لہو نہ ہو شامل

خود فریبی ہے پردۂ غفلت ۔ خود ستائی سے کچھ نہیں حاصل

کب تک آوارگی و رسوائی ۔ خود کو پہچان اپنے آپ سے مل

چپ رہوں تو دماغ جلتا ہے ہونٹ کھولوں تو سب اثر زائل

اے پریشاں نظر خدا سوں ڈر

رام مجنوں ہے لیلیٰ محمل

مزمورِ میر مغنّی کے محوّلہ بالا اشعار کے مقابلے میں یہ غزل بہرحال خالدؔ کی آسان شاعری کے ضمن میں آئے گی۔ آخری شعر کے پہلے مصرعے میں "سے" کی جگہ پر "سوں" خالدؔ کی "کلاسیکیت" کا شاہد ہے میرا خیال ہے کہ اس قسم کی کوششوں پر شاید کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ میری رائے میں یہاں اس لفظ کا استعمال لطف دے گیا ہے۔

میں نے ان سطور کے آغاز میں خالدؔ کی جن آسان منظومات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ابھی تک اُن کے کسی ایسے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں جو کتابی صورت میں منظرِ عام پر آگیا ہو۔ بلکہ ایسی منظومات حال ہی میں اخباروں اور رسالوں کے ذریعے سامنے آئی ہیں یا عبد العزیز خالدؔ کی بیاض میں موجود ہیں۔ اب میں ایسی نظموں، غزلوں وغیرہ سے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے میرے اس دعوے کی دلیل مل جائے گی کہ خالدؔ کی مشکل شاعری آسان ہو رہی ہے۔ خالدؔ نے اپنی ایک نظم میں مجاہدینِ وطن سے خطاب کیا ہے، اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے:-

اے موت کے ہمرازو! اے سرحدی آوازو!

اے زمزمہ پردازو! خوش معرکہ جانبازو!

تم بجلی کا کوندا ہو، تم رعد کا کڑکا ہو

وہ شعلہ جو باطل کی پھنکار سے بھڑکا ہو

وہ دل جو وطن کی ہر افتاد پہ دھڑکا ہو

تم تارے شبِ غم کے، تم نور کا تڑکا ہو

اے اہلِ وطن! تم بھی گھر گھر یہ صدا کر دو

جو پاس ہے لے آؤ، درِ فیض کا وا کر دو

سنگِ درِ مے خانہ کو قبلہ نما کر دو

ہر شاعرِ بزم آرا کو شعلہ نوا کر دو

دامن کی ہوا دے کر صرصر کو صبا کر دو

جو سانس میسّر ہے وہ وقفِ دُعا کر دو

پہلے بند میں لطفِ قوافی بھی خالد ایسے "خشک شاعر" کی شاعری میں شاید ایک اچھا شگون سمجھا جائے گا

خالد کی ایک اور نظم کے یہ اشعار دیکھیے :۔

جاتا نہیں برباد کبھی خونِ شہیداں

ہوتے ہیں اسی خوں سے درو دشت فروزاں

کرتے ہیں اسی خُوں سے حنا بندیٔ خوباں

ہوتی ہے اِسی خوں سے صحیفوں کی کتابت

دُھلتی ہے اسی خوں سے گناہوں کی سیاہی

ہے بندۂ مومن ہی فقط وارثِ جنّت

تا زندگی اُس کو رہے ارمانِ شہادت

وہ موت تِری راہ میں جو آئے الٰہی!

اُس موت پہ خود تجھ کو بھی رشک آئے الٰہی!

"اے مجاہد" کے زیرِ عنوان ایک غزل نما نظم کے یہ اشعار بھی اسی ضمن میں آئیں گے :۔

روئی کی طرح پہاڑوں کو دھنک سکتا ہے ‏ ‏ حشر سے پہلے تو کر سکتا ہے برپا محشر

تجھ کو زیبا ہے مقیمِ دلِ خوباں ہونا ‏ ‏ لیتی ہے تیرے قدم خاکِ سرِ راہ گزر

مثل و مانند زمانے میں نہیں آج ترا ‏ ‏ رحمتیں ہر دو جہاں کی ہوں نچھاور تجھ پر

"اے سر بکف مجاہد" غالباً نومبر ۱۹۷۱ء کی جنگِ پاک و ہند کے موقعے پر کہی گئی تھی :۔

دیتا ہے دل دُعائیں، کرتے ہیں لب ثنائیں

آ آ کے جب ہوائیں، قصّے ترے سُنائیں

لیتی ہیں پُرنم آنکھیں، جھم جھم تری بلائیں

تاجِ سرِ زمانہ، خاکِ رہِ حجازی!

اے سربکف مجاہد، اے سرفروش غازی!

نسبت تجھے حرم سے، بیزار تُو صنم سے

پروائے بیش و کم سے، فکرِ نشاط و غم سے

اللہ کے کرم سے، اس کے نبیؐ کے دم سے

مجھ میں گداز و رقّت تجھ میں ہے بے نیازی

اے سربکف مجاہد! اے سرفروش غازی!

تُو نُور کا منارا، تُو مان ہے ہمارا

اِس قوم، اس وطن کی تُو آنکھ کا ہے تارا

جس کی بہادری کا شاہد جہان سارا

باطل کے ہاتھ جس نے ہاری کبھی نہ بازی

اے سربکف مجاہد! اے سرفروش غازی!

کورہ جنگ کے زمانے میں خالد نے حقیقی طور پر ایک شاعرِ ملّت کا کردار انجام دیا اور اُن دنوں بہت
چھ لکھا۔ یہ نظم بھی غالباً اُنہی دنوں کی پیداوار ہے۔ چند اشعار دیکھیے :-

اے ارضِ زندہ دلاں! اے دیارِ پاکستاں — تُو میری رُوحِ رواں، تجھ پہ جان و دل قرباں

تری ہواؤں کی بخشش، تری فضاؤں کی دین — مری نمود، مری آگہی، میرا عرفاں

تُو میری ہستیٔ ناپائیدار کا شاہد — تُو میری زندگیٔ جاوداں کا مرتبہ داں

ہے تیرے ساتھ ہی جو بھی ہے آبرو میری — میں تیرا زمزمہ خواں، تجھ سے میرا نام و نشاں

ہوئے ازل میں وفاداریوں کے قول و قرار
نہ جیتے جی کبھی نکلیں گے چاہ کے ارماں
کیا شکار مجھے تیرے حُسن نے ورنہ
اُٹھاؤں نازِ بُتاں مجھ میں اتنی تاب کہاں
جو اہلِ دہر کا ہے آسماں وہ تیری زمیں
تیری ثنا کے لئے لفظ ڈھونڈتی ہے زباں
اُسی کے نام پہ تیرا قیام و استحکام
اُسی کے نام پہ تیری بقا کا ہے امکاں

یہ نعتیہ نظم بھی غالباً اُسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس میں "سقوطِ ڈھاکہ" پر شاعر کے تاثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

یا رحمتہ اللعٰلمین، یا رحمتہ اللعٰلمین!
پُرجوش، سادہ، سخت کوش انسان کی یہ سرزمیں
راہِ وفا میں جان کے نقصان کی یہ سرزمیں
کھوٹے کھرے کردار کی پہچان کی یہ سرزمیں

یہ بہرے، گونگے، اندھے، بے بس بھولے بھالوں کا وطن
ٹھکرائے، دھتکارے، جیالے، خستہ حالوں کا وطن
اے کالی کملی والے! تیرے آستاں پر آئے ہیں
ساتھ اپنے آہوں، آنسوؤں، زخموں کے تحفے لائے ہیں
اک ملّتِ واحد ہیں کافر قہرمانی طاقتیں
تیرے سوا حالِ دلِ آفت زدہ کس سے کہیں
آہوں سے دم گھٹتا ہے سینے میں خدایا کیا کریں
ڈر ہے مبادا ضبطِ گریہ سے کلیجے پھٹ پڑیں
مرنے کی کیا صورت نکالیں کس طرح زندہ رہیں

علاّمہ اقبالؒ نے "شاعر" کے زیرِ عنوان فرمایا ہے:۔

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم

منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ

کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

عبدالعزیز خالد علامہ اقبال کے مذکورہ "شاعر" پر بہت حد تک پورے اُترتے ہیں۔ اُن کے سینے میں ایسا حسّاس دل موجود ہے جو مُلک و ملّت پر گزرنے والے کسی حادثے یا ابتلا پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اور ایسے ہر موقعے پر اُس کی دھڑکن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ سال جب سیلاب آیا تو خالد کی آنکھوں سے درد کے آنسو حسبِ ذیل اشعار کی صُورت میں ڈھلک آئے ؎

اے فلک رُک جا! نگل لے اپنا پانی اے زمیں

کیا یہ عالمگیر بربادی ابھی کافی نہیں؟

موجیں اُٹھتی ہم نے دیکھی ہیں پہاڑوں کی طرح

دہشتِ نظارہ سے سکتے میں ہے جانِ حزیں

پھُوٹ کر رویا ہمالہ یا کہ یہ سبے ٹوٹ کر

وہ سمندر جو کہ ہے بالائے چرخِ ہفتمیں!

~~~ : ~~~

اے خدائے عادل و فادر! بادلوں کے منتن

شدّتِ اندوہ سے روحیں پریشاں ہو گئیں

کیا اسی کا نام ہے سنتے تھے جو طوفانِ نوح

وہ زمیں سے آسماں کا انتقامِ اوّلیں
~~~

بے قرار و بے دیار و بے خود و بے خانماں
کیا اب ان اُجڑے ہوؤں کا بھی ٹھکانا ہے کہیں
یہ دُرود و نعت کا گھر ، لوک گیتوں کا نگر
سادہ دل لوگوں کی بستی ، یہ اذانوں کی زمیں
اس کی ویرانی کا کن آنکھوں سے اندازہ کریں
ہے یہ خاکِ پاک ناموسِ دو عالم کی امیں
مرنے والوں کو بچالے تیری قدرت ہے بڑی
اے خداوندِ خدا ! اے عرش کے بالا نشیں
ڈھالتا ہوں شعر کے پیکر میں دل کی آگ کو
کیا کروں مجبور ہوں ، شاعر ہوں پیغمبر نہیں

جنگی قیدیوں کی واپسی پر خالد نے جن الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا۔ اس سلسلے میں یہ تین شعری اندازے کے لئے کافی ہیں :۔

زمیں شادماں ہو منائے خوشی آسماں
اسیری سے آتے ہیں واپس ہمارے جواں
ہواؤں کے ہونٹوں پہ ہیں خیر مقدم کے گیت
درختوں کی شاخیں بجاتی ہیں تھہنائیاں۔
مبارک جو اس کے سبب سے ستائے گئے
خدا کی رہوں میں جنھوں نے سہیں سختیاں

خالد کی ایک نظم "حکایتِ نئے" ہے۔ یہ عنوان مولانا رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے :۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

اِس نظم میں نہایت آسان انداز سے معروف رومانی کرداروں کے ناموں کا ذکر ہے۔ اِس نظم سے خالدؔ کی قادرالکلامی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف غیر مربوط طور پر چند اشعار درج کئے جارہے ہیں ؎

ترے دیار کی خوشبو سے اے چمن آرا
مشامِ جاں کو معطّر کرے نسیمِ صبا!

میں سوہنی تُو مہینوال اے مرے دلدار
میں صاحباں ہوں تُو مرزا، میں ہیر تُو رانجھا

نہ ہو یہ عاشق و معشوق کی خوشی میں شریک
حسد زمانے کی عادت ہے کیا گلہ اُس کا

معاملاتِ محبّت نہ رہ سکیں مخفی
نظر سے لوگ لگالیں سُراغ باطن کا

میں دل کی آگ کو حرفوں میں کس طرح ڈھالوں
مجھے فسانہ و افسوں کا فن نہیں آتا!

"محاورۂ حُسن و عشق" خالدؔ کی ایک لطیف نظم ہے۔ چند منتشر اشعار سے لطف کا اندازہ کیجیے:۔

اب تابِ انتظار نہیں، پہلے ہی بہت
دل خستۂ کشاکشِ نزدیک و دُور ہے

بے بس ہیں دونوں، دونوں ہی مجبورِ شوق ہیں
میری خطا ہے اس میں نہ تیرا قصُور ہے

آ میری بزمِ ناز میں جب لوگ سو چکیں
مجھ کو ترے خلوص پہ فخر و غرُور ہے

بولی کہ دیکھتا ہے خدا، کیا کہے گا وہ ٭ میں نے کہا: وہ ذات رحیم و غفوُر ہے

"تسخیرِ قمر" کی بات دو شعروں میں مکمّل ہوگئی ہے :-

چاند کی فتح مبارک ہو بنی آدم کو

دَورِ سیّاحیِ افلاک کا آغاز ہُوا

تگ و دو جس کی تھی میخواری دعریانی تک

عِلم کے زور سے وہ گنبدِ گردوں پہ چڑھا

الف لیلیٰ میں ابوالحسن نامی ایک شخص کا قصّہ مذکور ہے۔ جو خواب میں بادشاہ بن جاتا ہے۔ لیکن خواب کا طلسم ٹوٹتے ہی اس کی حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ یہ سارا قصّہ خالد نے ایک نظم میں بیان کیا ہے اور بہت آسان انداز سے بیان کر دیا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے قصّے کا ربط تو قائم نہیں رُکے گا البتہ یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سارا واقعہ کس آسان انداز میں منظوم کر دیا گیا ہے۔

دلربائی ہے شیوۂ خُوباں — کافروں میں وفائے عہد کہاں

جس کے رُخسار تھے گلاب کے پھُول — ہونٹ جس کے انار کی کلیاں

کتنا پیارا تھا رات کا نارا — آہ! وہ انتظار کی گھڑیاں

کیا کروں ذکرِ چشمِ ساقی کا — کیا کہوں حالِ گردشِ دوراں

آنکھ جھپکی بدل گئیں آنکھیں — دے کے جھٹکا چھڑا لیا داماں

کیسی پرسش کہاں کی دلداری — دید کو ترسے دیدۂ حیراں

اب نہیں سر میں پیار کا سودا — اب نہیں دل میں چاہ کے ارماں

ایک اور نظم کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے بھی خالد کی مشکل گوئی کا خوف دُور کرنے میں مدد ملے گی۔

اگر دیکھو تو ہر محفل میں شامل — اگر ڈھونڈو تو بے نام و نشاں ہیں

نہیں غرض ہُنر کا ہم کو سودا — فقط سوزِ دروں سے نغمہ خواں ہیں

بڑی نعمت ہے بے برگ و نوائی — سرو ساماں لُٹا کر شادماں ہیں

افق پر یہ اندھیرے کے پھریرے | چراغِ آخرِ شب کا دھواں ہیں
خدا وندانِ بحر و بر سے پوچھیں | نگاہیں بے زبانوں کی زباں ہیں
در و دیوارِ شہرِ آرزو پر | لہو کے چھینٹے جلنے کے نشاں ہیں
لگے یوں دوستوں کے جمگھٹے میں | کہ جیسے دشمنوں کے درمیاں ہیں
تکلف برطرف اربابِ اردو | ترے بس نام کے اہلِ زباں ہیں
اگرچہ رہنے والے ہیں زمیں کے | مگر دانائے رازِ آسماں ہیں

حسب ذیل چھوٹے چھوٹے شعروں میں کتنی بڑی بڑی باتیں کہی گئی ہیں :۔

مجلسیں ہیں امانتوں کے ساتھ | فرض ہے پاسداریِ پیماں
بے خطر آگ کے سمندر میں | کود جاتے ہیں صاحبِ ایماں
ہے دل و جان سے عزیز مجھے | دار الاسلام ارضِ پاکستاں

لیجیے، اب آپ کو خالد کی غزلوں سے کچھ اشعار سنائیں :۔

صبا کے رس میں تجھے گھونٹ گھونٹ پیتا ہوں
گلِ بہار کی خوشبو میں سونگھتا ہوں تجھے

سحر کی پلکوں سے ڈھلتا ہے رات کا کاجل
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں ایک اک کر کے

گھڑی جدائی کی روزانہ بڑھتی جاتی ہے

دل آرزو سے لبالب ترہ ترہ چھلکے
کبھی سراب سے صحرا کی پیاس بجھتی ہے

ندی کنارے پہنچ کے بھی ہونٹ تر نہ کیے

نہیں ہے میری محبّت جواب کی طالب
کہ سوز و سازِ تمنّا ہے آپ اپنا صلہ
میں مثلِ تاروں کے شب بھر سفر میں رہتا ہوں
میں منتظر ہوں مگر انتظار ہے کس کا؟
حیا سے عارضِ گلنار تمتمائے ہوئے
لبوں پہ موجِ تبسّم شراب آلودہ
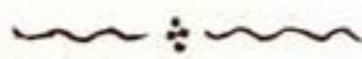
~~~ ٭ ~~~

کس نے سیکھی ہے فغاں بلبلِ خوش الحاں سے
محرمِ حیرتِ گُل کون ہے شاعر کے سوا
ایسے اترا کے نہ چل اے صنمِ عشر خرام
جسم پر ناز نہ کر، خاک میں مل جائے گا
تیری آنکھوں میں کئی بھید بھری باتیں ہیں
دیکھنا اے نہ اُڑے ان کو ہوا کی چڑیا

~~~ ٭ ~~~

ہے تیری پلکوں پہ کس کے زوال کا سایہ
ہے تیرے ہاتھ میں کس کے خیال کا داماں
ہوا ہے کس کا جگر خوں، بجھا ہے کس کا چراغ
شفق کی آگ میں شامل ہے کس کے دل کا دھواں
کٹی ہے مرگِ مسلسل میں زندگی جن کی
یہ جُرمِ عشق کی تعزیر ہے اے اہلِ جہاں

گرہ میں مال ہے جن کے وہ اہلِ ذوق نہیں

جو اہلِ ذوق ہیں مفلوک و بے سروساماں

رقم ہیں چہرِ دل پہ اسبابِ خانہ ویرانی

عیاں ہیں آنکھوں سے اسرارِ گردشِ دوراں

~~~~ ❊ ~~~~

اے رونے والے رونے سے کچھ فائدہ نہیں

ہے ضبط ہی علاج غمِ لاعلاج کا!

اے دل! کہاں ہیں تیری پُرانی محبّتیں

تھا حُسنِ ظاہری پہ تُو کتنا فریفتہ

برپا ہے اس میں فرض و محبّت کی کش مکش

خالد کا دل ہے درد کی لذّت سے آشنا

~~~~ ❊ ~~~~

الفاظ پُر آواز مگر قحطِ نوا ہے / یہ ساعتِ نامحکمیٔ حرفِ وفا ہے

کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی / وہ شورِ قیامت ہے کہ شلِ دستِ دعا ہے

اعجازِ مسیحا کی بڑی بات ہے لیکن / یارب! کہیں بربادیٔ دل کی بھی دوا ہے

مُرغانِ قفس کشمکشِ دام سے چھوٹے / یا نظم و نسق باغ کا برباد ہُوا ہے

~~~~ ❊ ~~~~

اے غرورِ پارسائی! یہ بتا / تیری نیکی سے خدا کو نفع کیا؟

تاج دے، دولت دے لیکن دل نہ دے / بیچ دے ہر چیز عزّت کے سوا

ہو نہ کچھ کہنے کو تو خاموش رہ / بے تفکّر جوش ہے بے فائدہ

کون واقف تھا دلوں کے بھید سے / کش مکش نے راز افشا کر دیا
~~~~
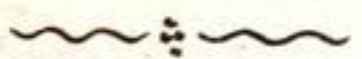
دل کو ہاتھوں سے مسلتا ہے کوئی ہر طرف ہے مہوشوں کا جمگھٹا

ان مثالوں سے آپ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ خالد کی غزل اگرچہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے غزل کے تسلیم شدہ سانچے کے مطابق ہے لیکن اس کی معنویت، اس کی انفرادیت کی عکاس ہے۔ ذیل کے اشعار سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گی۔ دیکھیے یہ اشعار بظاہر ایک روایتی غزل کے سے ہیں لیکن اپنے مفاہیم و معانی کے اعتبار سے وہ روایتی غزل سے بہت حد تک مختلف ہیں:۔

جادۂ راہِ عدم میں رکھ قدم آہستہ تر کر تب و تابِ دلِ پُرخوں کو کم آہستہ تر

موت بھی ہم کو ہے پیاری زندگانی بھی عزیز سوگِ جاں میں اُترا اے زہرِ غم آہستہ تر

مسجدیں معمور، گھر آباد، میخانے بھرے ان کی پیدائی کی لیکن کھا قسم آہستہ تر

گرچہ ہنگامے نشاطِ زندگی کے ہیں وہی ہے صدائے سازِ مستی دم بدم آہستہ تر

خالد کی غزل میں تغزل کے یہ شاندار نمونے بھی ملتے ہیں:۔

ازل کی صبح سے شامِ ابد تک محبت داستاں در داستاں ہے

کئی عالم ہیں از خود رفتگی کے ہر اک عالم جہاں اندر جہاں ہے

خزاں کا چاند پیلا ہے مگر کیوں کسی کے غم میں یہ بھی سرگراں ہے
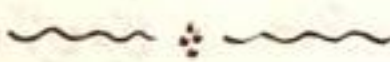
~~~ ٭ ~~~

اے شیشہ گرو! ہے کوئی پیوند کی صورت ٹوٹا ہے وہ آئینہ کہ جو قبلہ نما ہے

جو چاہو کرو اس ورقِ سادہ پہ تحریر ہر لمحہ جو آتا ہے اچھوتا ہے، نیا ہے

خالد کی غزلوں میں اس قسم کے "غیر معمولی" اشعار بھی ملتے ہیں:۔

کلیمی میں نہ ہو رنگِ خطابت
کہ ہے یہ سوزِ دل کا کھیل سادا

صدا لگاتے ہیں اہلِ فسانہ و افسوں
نئے چراغ پرانوں سے کون بدلے گا
~~~

ہو جن کی دوستی و دشمنی خدا کے لیے
کبھی کریں نہ خیالِ ملامتِ دُنیا

تم کہاں جاؤ گے آخر زندگی سے بھاگ کر
خیر و شر کی جنگ میں جم کر دلیرانہ لڑو

ہے جزوِ اعظمِ ایماں محبّتِ انساں
نہیں ہے مردِ مسلماں کو شاید اس کی خبر

ہر کس و ناکس کے آگے جھینکنے سے فائدہ
بے خبر فریاد کر فریاد رس کے سامنے

زندگی سے موت کم پیاری نہیں مجھ کو مگر
زندگی بہتر ہے جب تک زندہ رکھ یا رب مجھے

سرگرم سخن دل سے جو رہتی تھی ہمیشہ!
اُن آنکھوں میں اب کوئی حکایت نہ شکایت

ہے مجھ میں کوئی عیب تو اک حُسن پرستی
دل شیفتۂ حسرت، نظر آئینۂ حیرت

یہ دل مرا کسی قیصر کا خیر خواہ نہیں
چلے نہ اس پہ فریبِ فسانہ و افسوں

گر آرزوئے ہم آغوشیِ نگار کرو گے
تو رفتہ رفتہ رہِ ترک اختیار کرو گے

عاشقِ حُسن، مگر پاک نگاہ
ہم سے دیوانے زمانے میں کہاں

خالد بنیادی طور پر اسلامی روح کا شاعر ہے۔ نظموں کے علاوہ اس کی غزلوں میں بھی حمد و نعت کے

ساتھ ساتھ اسلامی فکر کی مثالیں موجود ہیں ۔

امام و نور و ہدایت ہے، ذکرِ رحمت ہے
دمِ طلوع تلاوت سے دل کو تازہ کروں!

ہے اُٹھتے بیٹھتے تیرا ہی نام وردِ زباں
ترے ہی نام پہ یارب جیوں اسی پہ مروں

پچھلے پہر اُٹھ کے کرے سرگوشیاں رب سے
خالدؔ جو نظر آتا ہے کچھ اُس سے سوا ہے

کرتے ہیں باہم ثنا جس کی ستارے صبح کے
آخرِ شب مجھ کو بھی یارب! جھلک اس کی دکھا

ہر طرف جلوہ ہے تیرا، ہر طرف تیرا ظہور
اسمِ اعظم ہے ترا اِسم، اے محمدؐ مصطفےٰ

اطاعتِ نبیؐ پاک ہے اطاعتِ حق
ثنائے احمدِ مختار ہے ثنائے خدا

جو خود کتاب بھی ہے صاحبِ کتاب بھی ہے
بنا کے اس کو مشیّت نے سانچہ توڑ دیا

مشرق و مغرب پہ چھانے کے لئے
سمتِ بطحا سے اُٹھا ابرِ کرم

نامِ احمدؐ پہ فدا ہے خالدؔ
کر گیا نام یہ بے نام و نشاں

مجموعی طور پر خالدؔ کی شاعری میں حکمت و ادراک اور شعور و عرفان کی بیشتر مثالیں موجود ہیں شعر کے متعلق اس کا نظریہ بھی یہی ہے ۔ وہ ایک شعر میں کہتا ہے ۔

شعر کیا حکمت و ادراک نہیں؟
کیا نہیں شعر شعور و عرفاں؟

حکمت و ادراک اور شعور و عرفاں کی شاعری بالفاظِ دیگر ایک دعوتِ فکر ہوتی ہے اور فکر کا تعلق دل سے زیادہ دماغ سے ہے۔ جن لوگوں میں عبدالعزیز خالد کی مشکل گوئی کے نام پر ایک خوف اور ہیبت سی چھائی ہوئی ہے۔ اُنہیں فکر کو بروئے کار لا کر یہ خوف اور ہیبت دل سے دُور کر دینی چاہیئے۔

لیجیئے، آخر میں خالد کا ایک خوبصورت قطعہ ملاحظہ کیجیئے۔ یہ میرے اس دعوے کا مزید ثبوت فراہم کرے گا کہ خالد کی مشکل پسندی رفتہ رفتہ آسان گوئی کی طرف آ رہی ہے ؎

میں خوشی کی طرح تہِ دل سے
رنج و غم کو قبول کرتا ہوں
دوست کا یہ گراں بہا تحفہ
مُسکرا کر وصول کرتا ہوں

کمار پاشی

خالد کی شاعری میں شرنگار رس

سنسکرت ادب کے پہلے نقاد بھرت منی کا کہنا ہے کہ شرنگار رس مسرت کا چشمہ ہے مسرت کا لفظ بظاہر بہت محدود معنی کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ناٹیہ شاستر میں شرنگار رس کی جو تفصیلی تعریف ملتی ہے اس کے مطالعہ کے بعد یہ بات غیر مبہم الفاظ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بھرت منی نے تمام رسوں میں شرنگار رس کو شاعری میں خاص اہمیت دی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر لفظ مسرت میں وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور مسرت کا لفظ شرنگار رس کے سلسلے میں بھرت منی کے یہاں احساسِ جمال کی لامحدود حدوں کو منوّر کر دیتا ہے۔ جس کی روشنی میں رتی اور کام دیو کے قلبی اور جسمانی وصال کی مختلف جھلکیوں سے احساس کی سطح پر حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔

دراصل رس کا تعلق ذہن سے نہیں بلکہ دل سے ہے اور ایسی شاعری جو رس کا بودھ کراتی ہے اسے ایک خاص سطح پر محسوس کر کے اس سے لطف لیا جاتا ہے۔

میں نے اوپر شرنگار رس کے سلسلے میں رتی اور کام دیو کا ذکر کیا ہے۔ سنسکرت شاعری میں رادھا اور کرشن (رتی اور کام دیو) کے علامتی کرداروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ دراصل رادھا کسی عورت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو عورت کے جسم کی آنچ، اس کے تقدس، اس کی محبّت، حسن اور نزاکت اور ضبط کی ایک بھرپور علامت ہے۔ اتھروید میں وہ ہمیں دنیا کی خالق یعنی دھرتی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اور شرتیوں میں شکتی کے روپ میں، وہی شکتی جو آگ، ہوا اور اندر جیسے دیوتاؤں

میں سمائی ہوئی ہے۔ شکتی کا یہ روپ اور حسن اپنشدوں میں بھی بہت سے مقامات پر ظاہر ہوا ہے رادھا کا یہ روپ جو ویدوں کے زمانے میں دھرتی کی شکل میں ابھرا اپنشدوں اور پرانوں میں تکمیل کے مراحل طے کرتا ہوا سنسکرت شاعری میں اپنی مکمل صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

ایک ہندی نقاد "شیو پرساد سنگھ" نے رادھا کے متعلق لکھا ہے:۔

"دورِ وسطیٰ کے اگر پورے ادب کو ایک ہی لفظ میں بیان کرنا ہو تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ وہ لفظ ہے "رادھا"۔"!

رادھا عورت کی ایک ایسی گوشت پوست کی مورت ہے جس کے بدن کے ہر انگ میں کچی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اور جس کی روح کے ایک ایک گوشے میں بیکراں محبت کی لازوال چاندنی رقصندہ ہے۔

دراصل رتی اور کامدیو کے جنسی وصال اور عورت (رتی) کے جسمانی پہلوؤں کی ایک اعلیٰ سطح پر فنکارانہ لفظی نقاشی شرنگار رس کی اہم خصوصیت ہے اور جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عبدالعزیز خالد سے پہلے تک اردو شاعری میں شرنگار رس کے نمونے نہیں ملتے۔ خالد کی شاعری کے سلسلے میں شرنگار رس کی بات ان لوگوں کے نزدیک یقیناً حیرت کا باعث ہوگی جو خالد کو صرف بھاری بھرکم الفاظ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ اور شرنگار رس کا علم فراق کی رباعیوں کے وسیلے سے رکھتے ہیں۔ دراصل فراق سے لوگوں کو ضرورت سے زیادہ عقیدت رہی ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ فراق نے اس عقیدت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے "روپ" کی رباعیوں کے سلسلے میں بڑے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے[1] کہ وہ سنسکرت شاعری کے مزاج آشنا ہیں اور ان کی رباعیاں شرنگار رس کی عمدہ مثال پیش کرتی ہیں۔ لیکن ناٹیہ شاستر کی روشنی میں اور سنسکرت کی شرنگار رس شاعری کے مطالعہ کے بعد "روپ" کی رباعیوں کا مطالعہ فراق کے دعوے کو بے بنیاد ثابت کر

---

[1] میں نے کوشش کی ہے کہ موقعے موقعے سے نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں اور اردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آنے پائے ...... یہ رباعیاں سب جمالیاتی یا شرنگار رس کی ہیں ...... انسانی جمال کا احساس شہوانیت یا جنسیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا ...... (دیباچہ "روپ" فراق)

دیتا ہے۔ اور صاف لگتا ہے کہ وہ سنسکرت شاعری کے مزاج سے قطعی طور پر نا آشنا ہیں اور صاف بات تو یہ ہے کہ شرنگار رس شاعری کے بہترین نمونے بھی ان کی نظر سے نہیں گزرے۔

اس لمبی تمہید کے بعد اب میں خالد کی شاعری کی طرف آتا ہوں۔ ان کی شاعری کے بارے میں یوں تو بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں، مگر ایک بات عام طور پر بہت سے لوگ (جن میں بعض "پڑھے لکھے" لوگ بھی شامل ہیں) کہتے ہیں کہ خالد اپنی شاعری میں اردو، فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسے لوگوں کی نظر سے خالد کے وہ اشعار نہیں گزرے جن میں ہندی زبان کی سادگی اور سنسکرت زبان کا رس ہے۔ ان کی کتاب "کفِ دریا" کے مطالعہ کے دوران جب مندرجہ ذیل شعر میری نظر سے گزرا تو ودیاپتی کے گیتوں کی رادھا اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ ایک گناہ آلود تقدّس کو لئے ہوئے میرے سامنے آگئی ؎

سجن بدیس ہیں کٹتی نہیں ہے بیرن رات
یہ شاہ زور جوانی یہ سیج برہا کی

یہ شعر رتی کے ایک ایسے روپ کو پیش کرتا ہے جس کے ابتدائی نقوش ہمیں ودیاپتی کے گیتوں میں ملتے ہیں۔ خالد کی رتی بلاشبہ اپنے "حسن"، "اپنی شاہزور جوانی" اور گناہ آلود تقدّس میں بے مثال ہے۔ اس کردار کی تخلیق خالد کے یہاں بڑے فن کارانہ انداز میں ہوئی ہے۔ اور نتیجتہً ایک ایسی گوشت پوست کی گرم عورت نے جنم لیا ہے جس کے انگ انگ میں کامدیو کا نشہ دوڑ رہا ہے۔

کمر باندھتی ہے وہ مضبوط کر کے!
کہیں ناچنے میں نہ کھل جائے ساری

—— ٭ ——

مست ہتنی کی طرح مان بھری
جسم انگارے کی طرح دہکے

—— ٭ ——

باہنہ ہیں چنبے کی شاخوں کا ہلورا!
یار میرا ہے چناروں سوہنا

—— ٭ ——

گھومے ہزاروں جگہ اکیلی دُکیلی!
سیر کا لپکا ہے گھٹ کے گھر میں نہ بیٹھے

—— ٭ ——

اے کام دیو روپی! رُک جاؤ رات بھر کو
راتیں منجھیلی کاری، بوندیں کٹاریاں ہیں

—— ٭ ——

جھل مل جھل مل بدن کا سونا
لہرائیں لٹیں کمر سے نیچے!

—— ٭ ——

دشتِ شام، کلکِ موج، اور کفِ دریا میں رتی کا یہ روپ خالد کی تمام تر فنی صلاحیتوں کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ عورت کے جسمانی پہلوؤں کا ذکر اپنے شعروں میں جس شدت اور بے باکی کے ساتھ خالد نے کیا ہے۔ اس کی مثال اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ یہاں میں خالد کے چند اور اشعار پیش کرتا ہوں، جن میں اس کردار کے کچھ اور نقوش سامنے آتے ہیں:۔

سجدار، سڈول، گول، کومل
مٹی سے نہیں خمیر جیسے

—— ٭ ——

اے چاند اگر تو اس کو دیکھے
کوٹھے پر کبھی اکیلے سوتے

تیرے چہرے کا رنگ فق ہو
تو اپنی سب آن بان بھولے

— ٭ —

اس کے رنگیلے پاؤں کے پنجوں میں کیا اسرار ہے
رکھے زمیں پر جب قدم بجنے لگیں شہنائیاں

— ٭ —

چمپئی مکھڑا ہے، عنبریں زلفیں
کندنی پنڈا ہے، ریشمی ساری

— ٭ —

لیٹی ہیں چرواہیاں چنار سی جگ مگ
کیلے کے پتے بچھے ہیں پیڑ کے نیچے!

— ٭ —

مدھبھری نیند سے ماتی آنکھیں
جسم، پَو پھوٹ رہی ہو جیسے

— ٭ —

شیتل شریر، نین کنول، تن کنک برن
گورے سپید رنگ پہ ماتا بھبھوت کا

— ٭ —

اس سے قطع نظر کہ مندرجہ بالا اشعار شرنگار رس کا گیان کراتے ہیں اور ان کے مطالعہ سے سنسکرت ادب و شاعری پر خالد کی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔ ان اشعار کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر دیکھئے ؎

سجن بدیس ہیں کٹتی نہیں ہے بیرن رات
یہ شاہ زور جوانی یہ سیج برہا کی

اِس شعر میں جہاں سجن، بدیس، بیرن رات، برہا کی سیج ایسے الفاظ سنسکرت شاعری کا ایک جانا پہچانا پس منظر رکھتے ہیں وہاں "شاہ زور جوانی" ایسے الفاظ ہمیں بغداد الجدید (پاکستان، کی ریاستی بولی دیس پر فارسی کا غلبہ رہا ہے) کے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے اس گرم اور ریگستانی خطّے کی عورت کے جمال کا ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں ایک اور شعر بطور مثال پیش کرتا ہوں ؎

گلشن میں بہار آئے شگوفہ یہ شگوفہ
چل روہی کو لے یار یہ رُت ہے پکے پیلُو

اس شعر میں روہی اور پیلُو ہمیں پھر بغداد الجدید کے گرم خطّے کی طرف لے جاتے ہیں۔ جہاں ہمیں خواجہ فرید کے نغموں کی گونج سُنائی دیتی ہے اور روہی کے علاقہ کے ساتھ جو روایتی قصّے منسوب ہیں ان کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ پیلُو اس علاقے کی گرمیوں کا پھل ہے۔ تپتی دوپہر میں "شاہ زور جوانیاں" مل کر پیلو کی جھاڑیوں میں پیلو توڑ توڑ کر اکٹھے کرتی ہیں اور اونچی آوازمیں فرید کے نغمے گاتی ہیں اس پس منظر میں خالد کا یہ شعر دل میں کتنی ہی بھولی بسری کہانیوں کو تازہ کر دیتا ہے۔

اردُو شاعری نے شروع سے اب تک ارتقاء کی کئی منزلیں سر کی ہیں اور دَورِ جدید تک آتے آتے اس کے رنگ روپ میں برابر نکھار پیدا ہوا ہے۔ جدید شاعروں نے جہاں اپنی روایت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہاں بہت کچھ گنوایا بھی ہے۔ مسلسل ریاضت سے ہمارے بزرگوں نے لفظوں کو برتنے کا فن سیکھا تھا جسے ہم نے فضول سمجھ کر فراموش کر دیا ہے۔ اِس سلسلے میں خالد کی شخصیت بڑی منفرد ہے۔ جس نے مسلسل ریاضت سے اس فن میں مہارت حاصل کی ہے۔

دراصل شاعری مسلسل اور ان تھک ریاضت چاہتی ہے اور اسی ریاضت کی بدولت خالد نے شاعری میں لفظوں کو برتنے کا فن سیکھا ہے۔ ان کے یہاں ہر لفظ یہاں روایت کا پورا پس منظر رکھتا ہے

وہاں ان کے انفرادی تجربے کا احساس بھی کراتا ہے۔

خالد کی شاعری میں رتی ایک نیم تہذیب یافتہ قبیلے کی ایک تندرست و توانا عورت کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اور اگر اسے خالد کے شعروں کی مدد سے کینوس پر لکیروں اور رنگوں میں اُتارا جائے تو جنسی وصال کے نشے میں غرق ایک بھرپور عورت سا کار ہو کر ہمارے سامنے آجائے گی۔

چلتے چلتے میں اس بات کا اعتراف بھی کرتا چلوں کہ اس مختصر سے مضمون میں میں نے خالد کی شاعری کے صرف ایک ہی پہلو کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کی شاعری کا ایک نمائندہ پہلو تو ضرور ہے مگر اس کی تمام شاعری کا احاطہ نہیں کرتا۔ خالد کی شاعری رنگا رنگ ہے اور اس کی کئی جہتیں ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ خالد کے نقادوں کی نظر شرنگار رس کی طرف کیوں نہیں گئی جو خالد کی شاعری کا ایک اہم اور نمایاں پہلو ہے۔ اور یہ بات کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اس میدان میں خالد کو کسی حریف کا خطرہ نہیں ہے!

وزیری پانی پتی

ایک تخلیقی شاعر

دُنیا کے تمام علوم و فنون میں شاعری سے زیادہ ہمہ گیر اور ہمہ رس نہ کوئی علم ہے نہ فن۔ یہ زندگی اور کائنات کے تمام مظاہر و محاسن کا احاطہ کرتی ہے۔ فنون سے قطع نظر دنیا کے تمام علوم اپنے اپنے وسیع دوائر میں محدود ہیں۔ لیکن شاعری محیطِ کُل ہے۔ اور انفس و آفاق کی تمام وسعتوں کو اپنے اندر جذب کر چکی ہے۔ شاعری کی وسعتوں کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب شاعر اسے کسی فرد کی تعریف کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے تو اس طرح آغاز کرتا ہے ؎

ہاں مہِ نو! سُنیں ہم اس کا نام
جس کو تُو جھک کے کر رہا ہے سلام

کبھی کبھی وہ برگزیدہ شخصیت کی ستائش کے لئے اس قسم کی تمہید پسند کرتا ہے ؎

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم ❊ دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ❊ بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

"بیکسی ہائے تمنّا" اور "بے دلی ہائے تماشا" کا شکوہ سنج، لافِ دانش اور نفعِ عبادت پر تبصرہ کرنے کے بعد اپنے ممدوح سے اس طرح عرضِ مدّعا کرتا ہے ؎

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ بجز تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شاعری کی وسعتوں اور پہنائیوں کا اندازہ لگانا تساہل پسند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ ہمارے مُلک میں شعر و ادب کا مذاق رکھنے والوں کو ادب نواز کہا جاتا ہے۔ یقین کیجئے کہ شعر و ادب کی اس سے زیادہ

تذلیل تصوّر میں بھی نہیں آسکتی۔ دُنیا کے مہذّب ملکوں میں ایسے اشخاص جنہیں شعر و ادب سے تعلّق نہ ہو، غیر مہذّب اور غیر متمدّن سمجھے جاتے ہیں۔ گویا لوگ اپنے کو غیر مہذّب لوگوں سے متمائز و ممتاز کرنے کے لئے شعر و ادب سے تعلّق پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں شعر و ادب سے اِس قسم کا لگاؤ یا علاقہ پیدا کرنے والوں کو شعر و ادب کا پروردگار نیز شعراء ادباء کا ماویٰ و ملجا قرار دیا جاتا ہے ؎

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

جناب عبدالعزیز خالد کے شعری کمالات پر تبصرے کے سلسلے میں اس طویل تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی شاعری بجائے خود بہ اعتبارِ مواد و موضوعات دُنیا کے ماضی و حال نیز دیر سے نزدیک، مستقبل کو بھی اپنے جلو میں لئے ہوئے نظر آتی ہے۔ شاعری کو صرف روایتی تغزّل تک محدود رکھنے اور سمجھنے والے، جن کے نزدیک شاعری، مقتل، کوچۂ قاتل، رقیب و آغوشِ رقیب، ساقی، جلوہ، کلیم و طُور، قطرہ و دریا، ذرّہ و صحرا، زلف، گیسُو، گیسُوئے پیچاں، زلفِ چلیپا، شبِ وصل، شبِ فراق، یگانہ و بیگانہ، جنون و خرد، دشت پیمائی، طوفان، کشتی، ساحل، بہار و خزاں، بلبل و صیاد، خار و گُل کے تذکروں تک محدود رہے۔ وہ جب بزمِ شاعری میں آفاقِ قدیم و جدید کے بہت سے حوادث، سوانح، صدہا تاریخی اور ما فوق التاریخ شخصیتوں کا جلوہ بے محابا دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔ کیا سمجھیں گے اور کیا کہیں گے!

اب سوال یہ ہے کہ اگر لوگوں کے سوچنے، سمجھنے اور کہنے کے خطرات کو سامنے رکھا جائے تو دُنیا کی ترقی رُک جائے گی۔ اِس بات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر سرزنشِ خلق اور فسادِ خلق کے ہنگاموں کو سامنے رکھا جاتا، تو آج دنیا میں نہ فلسفہ ہوتا نہ سائنس۔ نیز تعمیرِ حیات و کائنات کی تمام انسانی صلاحیتیں مفلوج و منجمد ہو کر رہ جاتیں۔

خالد کی شاعری ایک ایسے مصوّر کا نگار خانہ ہے جس نے تمام دُنیا کو دیکھا، پرکھا اور سمجھا ہے اور اس کے بعد تمام اَلوانِ معلومہ اور ان کے امتزاج سے جس منظر کو چاہا، پیکرِ تصویر میں ڈھال دیا ہے۔ یہ نگار خانہ اُس دیہاتی "چتر کار" کے نگار خانے سے یقیناً مختلف ہونا چاہیے جس کے یہاں

پنگھٹ، چوپال اور چوپایوں کی تصاویر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

دراصل خالد کی شاعری کو سمجھنے سے پہلے اُن کی افتادِ مزاج اور وسعتِ علم کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کے یہاں جمالیاتی اور کائناتی فکر کا ایک نظام موجود ہے جس کے مدارج بھی واضح ہیں ان کے ذوق و فکر کی بلندی انہیں تنگنائے غزل میں بھی اندازِ گل افشانیٔ رفتار دکھانے پر قادر بنا دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بیان کے لئے وسعتیں بھی موجود ہیں۔ بڑے شاعر کی فکر فرسودہ اور پامال موضوعات میں بھی ندرت یا ندرت کے پہلو پیدا کر دیتی ہے۔ عشق اور متعلقاتِ عشق کے بارے میں کسی شاعر نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ لیکن میرؔ کی تفلسف پسندی نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا!

خالدؔ نے بھی تخلیقِ کائنات اور جلال و جمال کے تمام مظاہر کے متعلق یہی اندازِ فکر و نظر اختیار کیا، اور انہوں نے عہدِ عتیق کی شخصیتوں اور اصنامیاتِ عالم کے کرداروں پر شاعرانہ اور حکیمانہ انداز میں نظر ڈالی۔ اور اس سلسلے میں ان کا یہی مسلک واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اور جگرؔ کے اس نظریۂ حُسن کے قائل نظر آتے ہیں ؎

حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

اُن کے لئے حُسن و عشق مبحثِ قدیم و جدید سے بے نیاز ہیں۔ وہ سیفو اور دلائیلہ کا بھی ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ بُعدِ زمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور وہ ایک پُر اسرار ماضیٔ بعید کی بجائے حال کی ہستیاں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ خالدؔ کی ترتیلی تمثیلات اور طویل نظموں سے قطع نظر پہلے ہمیں اُن کے تغزّل و تفلسف کا جائزہ لینا چاہیے۔ ان کی غزل بقولِ خود ایک عالم پیش کرتی ہے

مقصدیت بغیر مقصد کے
فن کے پردے میں ایک عالم ہے

جذبات کے اُتار چڑھاؤ بھی دیکھئے ؎

دیکھ جذبات کا اُتار چڑھاؤ ہونٹ خنداں ہیں آنکھ پُر نم ہے
حُسن کھلتا ہے سوگواری میں کتنا دلکش لباسِ ماتم ہے

عرفی نے ذاتی محاسبے یا محاسبۂ ذات کے لئے ایک نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

اسی مضمون کو خالد نے کس سادگی سے پیش کیا ہے ؎

لے عدو ہی کے جائزہ اپنا ؛ طبعِ دشمن عیارِ محکم ہے !

خالد کے یہاں توارُدِ خیال و افکار کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن وہ اِن افکار کو اپنی غزلوں اور نظموں میں نہایت احسن طریقے سے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ خود کو نہ تو غزل کے اسلوب و ہیئت کا پابند بنانا چاہتے ہیں اور نہ موضوعات کا۔ وہ شاعروں کی اس روایتی محبوبہ کے قائل نہیں ہیں جو صرف گلنار، گلعذار وغیرہ ہوتی ہے، بلکہ انہیں سانولی رنگت بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے ؎

سلونا پن ملیحانِ عرب کا
وہی سنولائی سنولائی سی رنگت

خالد کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عشق ہے۔ جب ان کا تعشق پیرہن شعر قبول کر لیتا ہے تو ان کی نعتیہ شاعری اپنی بلندی، گہرائی، دلپذیری اور وسعت و بلاغت کے اعتبار سے اقبال کی نعتیہ شاعری سے قریب نظر آتی ہے۔ اقبال کی طرح خالد بھی عام نعت گو شاعر نہیں ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ تعبیرِ خوابِ خداوندِ خالق وہ نقشِ ہیولائے ارض و سما ہے
اُٹھے جاتے ہیں پردے ایک ایک کر کے یہ طوبیٰ ہے وہ سدرۃ المنتہیٰ ہے
طفیلی ہیں تیرے یہ آفاق و انفس انہیں تیری خاطر ہی پیدا کیا ہے

ترا حُسن آئینۂ اسمِ اعظم — تو اخبارِ کونین کا مبتدا ہے!
کوئی ملّتِ کفر سے جاکے کہہ دے — کبھی اوس سے شعلۂ گُل بجھا ہے
یہ لبّیک لبّیک کی صوتِ دلکش — نشیدِ دُعا ہے کہ بانگِ درا ہے

خالدؔ اور اقبالؔ کا موازنہ اگرچہ بعض لوگوں کو پسند نہ آئے گا لیکن اس کے باوصف ان کی طویل ترین نعت "فارقلیط" حُسنِ تخیّل اور اسلوب و ابداع کا معجزہ ہے۔ یہ نعت چار حصّوں پر مشتمل ہے، اور مجموعی ہیئت کے لحاظ سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ "فارقلیط" دنیا کی وہ طویل ترین نظم ہے جو بقیدِ ردیف و قافیہ تحریر کی گئی ہے، اور اس اعتبار سے خالدؔ کو وحیدِ عصر اور یکتائے روزگار شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس شخصیت پرست دُنیا میں اگر کسی عظیم و محیط شخصیت سے ان کا مقابلہ اور موازنہ پسند نہ کیا جا سکتا ہو تو بھی ان کی شاعرانہ عظمت و انفرادیت کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ادب میں کسی شاعر کی انفرادیت کئی بڑے شاعروں کی مابہ الاشتراک عظمت سے کم درجے کی چیز نہیں ہوتی۔ "فارقلیط" کے پہلے حصّے سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

میں فرشِ زمیں ہوں، تو سقفِ سما ہے — میں سانسوں کا مہماں، تو موجِ ہوا ہے
شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ — تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے
تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں — تو صلّ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے
ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ — تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے؟
کنارِ شفق میں لڑی موتیوں کی — گُلِ نو دمیدہ لبوں پر فدا ہے
بُوئے مُشکِ اذفر بسی ہے بدن میں — تیرا پیرہن قطعہ گلزار کا ہے
شہابی بدن زیبِ تن سُرخ جوڑا — کنول آبِ شفّاف پر تیرتا ہے
میں ہوتا تو وہ پاؤں دھو دھو کے پیتا — وہ مشروبِ رحمت ہے آبِ بقا ہے
نہیں نرم تر تیرے ہاتھوں سے ریشم — اَنَسؓ کہہ رہا ہے جو لمس آشنا ہے

کبھی مُشک و عود اس طرح کا نہ سونگھا پسینہ ہے تیرا کہ عطرِ حنا ہے؟

تو محمود و حامد تو مصدق و صادق تُو فخرِ انام و حبیبِ خدا ہے

سحر کی طرح صادق الوعد ہے تُو جو ذمّہ لیا اُس کو پُورا کیا ہے

خالدؔ ایک پُرگو اور کثیر الموضوعات شاعر ہیں۔ ان کی طویل ترتیلی تمثیلات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی غزلوں پر ایک نظر ڈال لی جائے جو انہوں نے غزل کی روایتی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی ہیں۔ ایسی غزلیں "زنجیرِ رمِ آہو" میں موجود ہیں جن میں سے جستہ جستہ اشعار ارقام کئے جاتے ہیں ؎

نشاطِ نغمہ بھی ہے مستیٔ خمار بھی ہے خزاں کا دور بھی ہے موسمِ بہار بھی ہے

اِک اضطراب اِک احساس تشنہ کامی کا ترے حضور ہیں ہیجان بھی قرار بھی ہے

خالدؔ غزل کے ایجاز و انتشار کے بھی قائل ہیں۔ لیکن شیوۂ ایجاز و انتشار کو وہ اپنے محبوب کی چشمِ فسانہ گو سے متعلق کر دیتے ہیں ؎

ستم ہے صنعتِ چشمِ فسانہ گو، جس میں
غزل کا شیوۂ ایجاز و انتشار بھی ہے

نغمہ پیرائی کا فلسفہ دیکھئے ؎

ایک پردہ ہے خود فریبی کا
یہ مرا ذوقِ نغمہ پیرائی

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

پھر ترے آستاں پہ لے آئی
کھینچ کر لذّتِ جبیں سائی

خالدؔ کی نظر ضرورت سے زیادہ متمدّن اور تکلیف دہ حد تک پُر تکلّف "شہرِ نگاراں" ہی کی دلدادہ و پرستار نہیں ہے بلکہ وہ حُسنِ صحرا کی دلنوازیوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں ؎

آفتِ عقل و ہوش ہے خالدؔ
اُس پری رُو کا حُسنِ صحرائی

ایک شعر دُوسری غزل کا ملاحظہ ہو ؎

بُوئے نسیم سے کبھی بادِ شمال سے
کسبِ نشاط کرتا ہوں تیرے جمال سے

فکرِ مآل سے بے نیازی کے سلسلے میں اکثر شعرا نے گُل اور خندۂ گُل پر تبصرے کیے ہیں۔ خالدؔ نے بھی فکرِ مآل سے اپنے محبوب کی بے نیازی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کتنے بلیغ انداز سے! ملاحظہ ہو ؎

اُس حُسنِ بے نیاز کی شادابیاں نہ پوچھ
گویا کہ بے نیاز ہے فکرِ مآل سے

خالدؔ کو ترکیبیں تراشنے میں بھی یدِ طولیٰ حاصل ہے ؎

واماندگیٔ دشتِ تحیّر ہے اور مَیں
یہ مختصر حیات مگر مختصر نہیں!

حُسنِ ملائک فریب عشق جنوں دستگاہ | ارضِ عجم میں لٹی سطوتِ کُردبیاں
خانہ خرابی کرے ذوقِ نظر کا فساد | اک نگہِ نیم رس سوجگر آشوبیاں
یہ دلِ آذر نفس، جس کو نشیمن قفس | خرمنِ رگِ صاعقات، خار و خسِ آشیاں

دشتِ تحیّر، جنوں دستگاہ، نیم رس، آذر نفس، خالدؔ کی طبع زاد تراکیب ہیں۔ اس غزل کا ایک شعر تو ناقابلِ فراموش ہے ؎

عرضِ تمنّا نہیں ایک نظر سے فزوں
حرفِ تمنّا مگر سلسلۂ بے کراں

خالدؔ اگر صرف غزل کے شاعر ہوتے تو ان کا سرمایۂ شعری چند سو غزلوں سے زائد نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن وہ شاعرِ ہمہ اصناف ہیں۔ انہوں نے عالمی کلاسیکی ادب اور کلاسیکی اصنامیات کو جامۂ شعری پہنا کر اردو کی وسعتوں میں انتہائی قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

اب "گلِ نغمہ" (گیتانجلی) کے چند حصے ملاحظہ ہوں:۔

بہار آفرینا ترے فیض نے — کہ ہے گلشن آرائے کون و مکاں
عطا کر کے معمورۂ آرزو — دلِ مختصر کو کیا بے کراں

مرے اس سبوئے سفالینہ کو — تہی کر کے بھرتا ہے تو بار بار
نئی زندگی کی مئے سُرخ سے — ہے پت جھڑ کے پردے میں گویا بہار

میں اک عودِ نالندہ ہوں اور تو — مغنّی کہ آتش نوا جس کا نام
مدام اک نیا زمزمہ چھیڑتا — خیابان دداری میں محوِ خرام

ترے لمسِ زندہ کی تاثیر سے — مرا دل ہے سرمستِ رازِ نیاز
دریغا کہ لفظوں میں ڈھلتا نہیں — مری روح کا سرمدی سوز و ساز

حسین سحر

ایک عظیم شاعر

قیامِ پاکستان کے بعد اردو کے شعری ادب میں جن ناموں کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اُن میں عبدالعزیز خالد کا نام ہر لحاظ سے نمایاں ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں مواد اور معیار کے اعتبار سے خالد نے اردو کو اپنے شعری سرمائے سے سب سے زیادہ مالا مال کیا ہے۔ اس کی تخلیقات موجودہ اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہیں۔ وہ ایک صاحبِ طرز شاعر ہے۔ اس کا عالمانہ اسلوب اور پُرشکوہ اندازِ بیان موجودہ شاعری میں سب سے منفرد اور جدا ہے۔ ایک صاحبِ طرز فنکار ہونے کے لئے ضروری ہے کہ فنکار کے اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات میں بھی انفرادیت اور تنوّع ہو۔ خالد کی پوری شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس کے بلند فلسفیانہ خیالات اور اس کے عالمانہ اندازِ نگارش میں ایک قسم کا فنکارانہ توازن ملے گا۔ یہی توازن اسے ہمعصر شعراء میں ممتاز مقام پر فائز کرتا ہے۔ اور یوں ہمیں اُسے ایک عظیم شاعر ماننا پڑتا ہے۔

خالد نے روایت سے کافی استفادہ کیا ہے۔ مگر اس کا یہ استفادہ سراسر تقلیدی نہیں۔ اُس نے قدیم روایات میں کچھ نئی شعری روایات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اور یوں روایت کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس کی شاعری نری روایات کے تابع نہیں، بلکہ اس نے تو اپنا راستہ خود بنایا ہے۔ جس کا وہ تنہا مسافر ہے۔

اکثر نقادانِ فن خالد کو دشوار پسند شاعر کہہ کر اس کے قریب نہیں پھٹکتے حالانکہ دشوار پسندی کوئی عیب نہیں، غالب و اقبال بھی تو مشکل پسند تھے۔ مگر خالد کی مشکل پسندی غالب و اقبال سے مختلف ہے۔ وہ فکری طور پر غالب و اقبال سے متاثر ضرور ہے۔ لیکن زبان کے معاملے میں دشوار پسندی اس کی اپنی ہے۔ وہ بیک وقت اردو، انگریزی، عربی، فارسی، عبرانی، یونانی، ہندی، اور

سنسکرت کے زبان و ادب پر حاوی ہے۔ چنانچہ مذکورہ زبانوں کے مختلف الفاظ اور خاص طور پر عربی زبان کے الفاظ و تراکیب اس کے کلام کی زینت ہیں۔ اس کا وسیع تبحّر علمی بھی اس دشوار پسند اسلوب کا باعث ہے۔ بقول شخصے عالمانہ خیالات کے اظہار کے لیے زبان بھی عالمانہ چاہیے۔ چنانچہ اس کے ہاں ادق اور کسی حد تک اجنبی الفاظ کی کثرت اسی وجہ سے ہے کہ اس کے خیالات دقیق اور عالمانہ ہیں۔ حقیقتاً وہ عوام کا نہیں خواص کا شاعر ہے اور اس کی شاعری وسیع مطالعے اور گہرے تفکّر کی شاعری ہے۔

موضوعات اور مواد کے اعتبار سے بھی وہ انتہائی متنوّع شاعر ہے۔ اس کی شاعری عربی ادب، یونانی دیومالا اور فارسی و اردو کی قدیم اساطیر سے شدید طور پر متاثر ہے۔ چنانچہ اس کی مختلف النّوع شعری تصانیف کے مطالعے سے یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ وہ ایک نہایت پُر گو شاعر ہے۔ اس کی شاعری کو ہم تین بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) تمثیلات (۲) تراجم، اور (۳) نظم و غزل

"سلومی"— "ورقِ ناخواندہ"— "دکانِ شیشہ گر"— اور "برگِ خزاں"— خالد کی منظوم تمثیلات ہیں۔ اس کو عتیقیات اور صنمیات سے گہری دلچسپی ہے۔ اور ان رزمیہ تمثیلات میں اُس نے مختلف یونانی صنمیات اور عہدِ عتیق کی داستانوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ اندازِ تحریر بھی ویسا ہی ڈرامائی اور متانت سے پُر ہے۔ خصوصاً مکالمے ان تمثیلات کی جان ہیں۔ "سلومی" انجیل مقدس کا ایک قصہ ہے جسے خالد نے نظمِ معرّیٰ میں پیش کیا ہے۔ "ورقِ ناخواندہ"۔ "دکانِ شیشہ گر" اور "برگِ خزاں" عبرانی عتیقیات اور یونانی صنمیات پر مشتمل منظوم ڈرامے ہیں۔

دُنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں رزمیہ اور تمثیل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبِ عالیہ کا بیشتر حصہ تمثیلات یا رزمیہ پر مشتمل ہے۔ خالد کی شاعری کا اصل جوہر بھی ان منظوم تمثیلوں ہی میں کھلتا ہے۔ وہ ایک کامیاب تمثیل نگار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی منظوم تمثیلات اردو کے عظیم شعری ادب میں بار پانے کے قابل ہیں۔

خالدؔ کے منظوم تراجم "سرودِ رفتہ" "رگِ نغمہ" "غزل الغزلات" اور "پروازِ عقاب" ہیں ترجمے کے لئے ضروری ہے کہ مترجم اصل زبان اور اس کے علمی و ادبی پس منظر سے بھی اتنا ہی واقف ہو جتنا خود اپنی زبان سے ہے۔ ترجمہ کا حُسن بھی یہی ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم نہ ہو۔ بلکہ اس پر اصل کا گمان ہو۔ خالدؔ کے منظوم تراجم بھی حقیقی معنوں میں ایک منفرد شعری حیثیت کے حامل ہیں۔ "سرودِ رفتہ" میں اس نے یونانِ قدیم کی حسین شاعرہ سیفو کی منتخب شاعری کو اردو میں منظوم کیا ہے۔ اس کا یہ ترجمہ اُردو کے شعری ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ ہماری شعری تاریخ میں آج تک کسی نے اتنا کامیاب ترجمہ پیش نہیں کیا۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔ اِن میں سیفو کی شاعری کی روح کا عکس کتنا تابناک ہے :۔

چاند کا زرد مرمریں بجرہ
قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلہ پروین کا بجھ کے راکھ ہوا
رات بھیگی، گریز پا لمحے
منزلِ نور کو روانہ ہوئے
سیج سونی ہے خواب گہ تنہا
اے شبِ تار اے دلِ رُسوا

—— ❖ ——

اگلے وقتوں سے فریطی کنواریاں
لہلہاتی گھاس کو پیروں تلے
کیف میں ڈوبی، مسلتی، روندتی
رقص کرتی آئی ہیں ہیکل کے گرد
ناز و نشّہ سے تھرکتا انگ انگ

چلبلے الھڑپنے کے رنگ ڈھنگ

پائلیں رن جھن چھنکتی پاؤں میں

بربط و مردنگ و طنبورہ سے سنگ

جیسے سونے پر سہاگہ جیسے چہرے پر تہاب

یہ حسیں شمشاد قد خورشید خد نسریں شباب

رقص کرتی آئی ہیں ہیکل کے گرد

"گلِ نغمہ" مہاکوی رابندرناتھ ٹیگور کی شہرۂ آفاق تصنیف "گیتان جلی" کا منظوم ترجمہ ہے اور خالدؔ کے خاص اسلوب میں ایک عظیم شعری صحیفے کا ایک عظیم شعری عکس ہے۔ نمونتہً دیکھئے:-

یہ ترا شعلہ بر انداز سرود

اے آقا

کیسے ہوتا ہے شبستانِ عدم سے پیدا

مجھے معلوم نہیں

آئی حصے میں مرے خامشی و حیرانی

بقعۂ نور زمیں

تیرے نغموں کی ضیا پاشی سے

گرم، جولاں سرِ افلاک بریں

نفسِ زندگی افروز سرودِ شیریں

--- ۞ ---

توڑ لے شاخ سے یہ ننھا پھول

اسے چن لے شتاب دیر نہ کر

مجھے ڈر ہے کہیں یہ آتشِ تر

بجھ نہ جائے ہوائے صَرصَر سے

"غزل الغزلات" کتاب "نشید الانشاد" کا ترجمہ ہے۔ جو خالد کی قادر الکلامی کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ "پرواز عقاب" معروف ویتنامی حُریت پسند رہنما ہوچی منہ کی "زنداں نامہ" کا ترجمہ ہے اس میں نظمِ آزاد کی ہیئت میں خالد نے ہوچی منہ کی ۱۱۴ زندانی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ اور ترجمے کا حُسن یہاں بھی پوری شعریت کے ساتھ موجود ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :-

ڈھلی سُرخی میں آخر رفتہ رفتہ فجر کی زردی

(دُرخِ خاور پہ لالی خُونِ انجم کی جھلک اُٹھی

سحر نے مُنہ سے سرکایا نقاب آہستہ آہستہ)

لپیٹا رات نے طومار اپنا (تہہ کیا خیمہ

اکھاڑیں سینۂ فرشِ زمرّد میں گڑھی میخیں)

اُجالے کی جھلک پاتے ہی چُپکے سے بڑھے سائے

حرارت پھیلتی ہے چار سُو آفاقِ عالم میں

اِدھر رہرو میں شاعر جاگتا ہے، گرم ہوتا ہے

(اُدھر شبنم میں بھیگا سبزۂ بیگانہ سوتا ہے)

خالد غزل گو بھی ہے۔ مگر اس کا اصل جوہر جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے منظم تمثیلات میں کھُلتا ہے۔ یا پھر مختصر اور طویل معرّیٰ و پابند نظموں میں "کفِ دریا" "زرِ داغِ دل" "زنجیرِ رمِ آہو" "کلکِ موج" "ماتمِ یک شہرِ آرزو" "دشتِ شام" "حدیثِ خواب" اور "خردِشِ خم" اس کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے ہیں۔ اور نثریہ مجموعے "فارقلیط" "منمنا" اور "حمطایا" ہیں۔

اس کی غزل میں روایت کی مکمل پابندی کے ساتھ ساتھ خوشگوار حد تک ایک نیا پن ملتا ہے جو اس کے نئے ذہن کی پیداوار ہے۔ چند اشعار دیکھئے:۔

دیکھ جذبات کا اُتار چڑھاؤ
ہونٹ خنداں ہیں آنکھ پُرنم ہے

—— ⁂ ——

حُسن کھلتا ہے سوگواری میں
کتنا دلکش لباسِ ماتم ہے

—— ⁂ ——

خواب و عمل میں رکھو توازن
عشق و خرد میں کیوں ہو خصومت!

—— ⁂ ——

نشاطِ نغمہ بھی ہے رنجشِ خمار بھی ہے
خزاں کا دور بھی ہے موسمِ بہار بھی ہے

—— ⁂ ——

اِک اضطراب اِک احساس تشنہ کامی کا
ترے حضور میں ہیجان بھی قرار بھی ہے

—— ⁂ ——

پھر ترے آستاں پہ لے آئی کھینچ کر لذتِ جبیں سائی
ایک پردہ ہے خود فریبی کا یہ مرا ذوقِ نغمہ پیرائی
آفتِ عقل و ہوش ہے خالدؔ اُس پری رُو کا حُسنِ صحرائی

—— ⁂ ——

بوئے نسیم سے کبھی بادِ شمال سے
کسبِ نشاط کرتا ہوں تیرے جمال سے
اس حسنِ بے نیاز کی شادابیاں نہ پوچھ
گویا کہ بے نیاز ہے فکرِ مآل سے

واماندگئ دشتِ تحیّر ہے اور میں
یہ مختصر حیات مگر مختصر نہیں!

خانہ خرابی کرے ذوقِ نظر کا فساد
اک نگہِ نیم رس، سو جگر آشوبیاں
یہ دلِ آذر نفس جس کو نشیمن قفس
خونِ رگِ صاعقات خار و خسِ آشیاں

عرضِ تمنّا نہیں ایک نظر سے فزوں
حرفِ تمنّا مگر سلسلۂ بے کراں

اس کی نظمیں بھی اس کے مخصوص فلسفیانہ طرز اور بلند آہنگ کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں اس کے ہاں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ عبرانی اور سنسکرت کے الفاظ عام ملتے ہیں موجودہ شاعری میں جعفر طاہر کے ہاں بھی پُرشکوہ الفاظ کا استعمال عام ہے۔ لیکن طاہر اور خالد میں فرق یہ ہے کہ طاہر کے یہاں فارسی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے اور خالد کے یہاں فارسی اور عبرانی کے علاوہ عربی کے الفاظ و تراکیب کا غلبہ ہے۔ بعض اوقات تو وہ پورے کے پورے مصرعے عربی میں کہہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ہاں تلمیحات کا استعمال عام ہے اس لحاظ سے اس کی نظموں کی زبان بھی منفرد ہے۔

خالد کی طویل نظموں میں "منمنا" اور "فارقلیط" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "منمنا" میں حضور نبی

کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے ذکر و فکر کے بعد شاعر ملتِ اسلامیہ کی بقا اور وطنِ پاک کی سر بلندی و سرفرازی کے لیئے دُعا گو ہے۔ ۴۴۴ اشعار کی اس طویل اور مسلسل نظم میں اعلیٰ شاعری کے متعدّد نمونے ملتے ہیں۔ اس کے ہاں عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کا خاصا امتزاج نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر شعر زبان و بیان کے لحاظ سے جامع آور مرصّع اور شعریّت سے پُر ہے۔

چند اشعار دیکھیے ؎ محمّدؐ انجمنِ کُن فکاں کا صدر نشیں

محمّدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم

شمار کرتے چلیں اس کی خوبیوں کا اگر

تو ساتھ چھوڑ دیں تھک تھک کے نیل، سنکھ، پدم

عمل ہے علم کا مقصود قیل و قال نہیں

وسیلۂ زر و منصب نہیں کتاب و قلم

چراغِ قافلۂ درد ہے دلِ پُر درد

صدف ہے سینے کا گنجینہ دارِ گوہرِ غم

ہجومِ شوق ہے شاعر ہے اور تنہائی

جگر فگار، نفس سوختہ، مژہ پُر نم

بلاشبہ "منحمنا" ہمارے نعتیہ ادب میں ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔

اُن کی دوسری طویل نظم "فارقلیط" ہے، جو اردو کی طویل ترین نعت ہے اور دُنیا کی عظیم نظموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ یہ نعت ساٹھ حصّوں پر مشتمل ہے اور اپنے اسلوب نگارش کے اعتبار سے ایک عہد آفرین نظم ہے۔ "فارقلیط" کے مختلف حصّوں سے منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے۔

میں فرشِ زمیں ہوں، تو سقفِ سما ہے

میں سانسوں کا مہماں، تو موجِ ہوا ہے

شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ

تو میرے تخیّل سے بھی ماورا ہے

تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں!

تو صلِّ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے

دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش

دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے

ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ

تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے؟

الٰہی میں ہوں طالبِ فتح و نصرت

لَکَ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تو کبریا ہے

ہمیں قومِ کُفّار پر کامراں کر

کہ تو صاحبِ دہشت و دغدغہ ہے

مرے اشک کرتے ہیں میری شفاعت

مرے جُرم سے عفو تیرا بڑا ہے

تری شان ہے احکم الحاکمینی

تو سرچشمۂ اقتدار و بقا ہے

حفیظ و حبیب و مقیت و مصوّر

ستائش تری جان و دل کی غذا ہے

--- ۞ ---

وہ نورِ نگاہِ بتولؑ و پیمبرؐ

مصلّے پہ گردن بُریدہ پڑا ہے

رہی جس کا گہوارہ آغوشِ مرسلؐ

لبِ نہرِ خوں خاک پر لوٹتا ہے

وہ برگ و برِ گلشنِ بوترابیؑ

لعینوں کے خنجر سے کٹ کر گرا ہے

نواسے کے در پَے ہے نانا کی اُمّت

تف صرصرِ غم سے دل بجھ گیا ہے

ہیں گورِ غریباں پہ چھینٹے لہو کے

یہ اجرِ شہیدانِ خونیں قبا ہے

یہ نظم ہر لحاظ سے زبان و بیان کا ایک شاہکار ہے۔ الفاظ کے معاملے میں خالد بہت محتاط شاعر ہے۔ لفظوں کے استعمال کا جو سلیقہ اُسے ہے وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہے۔

اس کا تیسرا نعتیہ مجموعہ "حمطایا" ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ "فارقلیط" اور "منحمنّا" کی طرح کوئی ایک طویل نظم نہیں۔ بلکہ مختلف نعتوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ نعتیں غیر مردف ہیں۔ مگر اکثر مردف ہیں۔ چنانچہ یہ نغمگی کے زیادہ قریب ہیں۔ اس طرح یہ نعتیں ہماری نعتیہ شاعری کی روایت سے بھی قریب ہیں۔ کہ ایک تو یہاں زبان نسبتہً آسان ہے۔ دُوسرے نعت کی روایتی ہیئت یعنی غزلیہ ہیئت میں ہیں۔ خالد صحیح معنوں میں ایک سچّے عاشقِ رسُولؐ ہیں اور ان نعتوں میں ان کا جذبہ ہر ہر شعر بلکہ ہر ہر لفظ سے پھوٹا پڑتا ہے۔ مختلف نعتوں کے چند اشعار دیکھئے ؎

اِس زباں سے کیسے ممکن ہے ثنائے دیگراں

چکھ چکی اک بار جو نعتِ نبیؐ کا ذائقہ

وہی ہے رُوحِ زمانہ وہی ہے جانِ جہاں

نہ جس کا کوئی قبیلہ، نہ جس کا کوئی وطن

کیا اُسی نے شناسائے رازِ مرگ مجھے
اُسی نے مجھ کو سکھایا ہے زندہ رہنے کا حق

نظر بیمار کی جیسے پڑے تیمارداروں پر
بہت تکلیف میں ہے نوعِ انساں یا رسُول اللہ

میرے سارے زمزمے ہیں اس صدا کی بازگشت
جس صدا کے لحن میں شامل ہے تنزیلِ خدا

جہاں سے راستہ فردوس کو نکلتا ہے
وہی ہے اے مرے اہلِ وطن، وطن میرا

یوں ہی آواز دیتا ہے خالدؔ نواحِ مدینہ مجھے
جس طرح آئے کوہِ ندا کی صدا یا اخی یا اخی!

عاشقِ مولائے کائنات ہے خالدؔ
رہتا ہے دیوانہ روبروئے محمدؐ

اُس کی تازہ شعری تصنیفات میں "حدیثِ خواب" اور "خروشِ خم" اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں اُس کا اسلوب پہلے کے مقابلے میں سادگی اور آسان پسندی کی طرف مائل ہے۔ ان میں بھی عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب کا استعمال ملتا ہے۔ لیکن اس طرح کہ کہیں بھی قاری کے ذہن پر بار محسوس نہیں ہوتا۔ "حدیثِ خواب" میں رومانی اور نیم رومانی انداز کی نظمیں اور غزلیں ہیں۔ اور

"خروشِ خم" میں قومی، ملّی اور رثائی نظمیں ہیں۔

غرض نعتِ رسولِ مقبولؐ ہو، یا منظوم تمثیلات، قومی و ملّی نظمیں ہوں یا اُن کی غزلیہ شاعری خالدؔ کہیں بند نہیں۔ اُس کا اشہبِ قلم ہر میدان میں رواں دواں ہے۔ اقبالؔ کے بعد ہمارے اسلامی شاعروں میں وہ سب سے عظیم اور قدآور شاعر ہے۔ جس کے پاس ایک پیغام ہے۔ انسانیت کی فلاح کا پیغام! اور یہی اس کی عظمت و رفعت کی دلیل ہے۔

بلاشبہ اُس نے اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ، نیا اسلوب اور نیا اندازِ فکر دیا ہے۔ اپنے بلند آہنگ، پُرشکوہ اسلوب اور عالمانہ اندازِ بیان کی بنا پر وہ نابغہ کہلانے کا مستحق ہے اور ہمارے شعری ادب کو اس نے جن بیش قیمت خزائنِ علم و فن سے مالامال کیا ہے وہ اُسے تاریخ ادب میں ایک نمایاں منصب عطا کرتے ہیں۔

تصانیف عبدالعزیز خالد

فارقلیط	"	۱۸/-
برگ خزاں	"	۱۸/-
دوکان شیشہ گر	"	۱۸/-
زنجیر رم آہو	"	۱۸/-
سلوی	"	۱۰/-
خروش خم	"	۱۵/-
غزل الغزلات	"	۱۰/-
کف دریا	"	۱۰/-
ورق ناخواندہ	"	۱۰/-
منحمنا	"	۱۰/-
بادشمال		زیر طبع
خدیازہ ساحل	"	"
دانہ ہائے ریختہ	"	"
ماذ ماذ		

لحن صریر	"	۱۰/-
کلک موج	"	۱۸/-
دشت شام	"	۱۵/-
گل نغمہ	"	۲۰/-
مزمور میر مغنی	"	۲۰/-
سرود رفتہ	"	۶/-
پرواز عقاب	"	۵۰/-
حدیث خواب	"	۱۲/-
اقبال و عطیہ	"	۹/-
حمطایا	"	۱۲/-
ماتم یک شہر آرزو		زیر طبع
غبار شبنم	"	"
زر داغ دل	"	"
زیر طبع		

مفصل فہرست طلب کریں

آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور